سرمایۂ ادب

(پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی مطبوعات کا اشاریہ)

علامہ اقبال بھوپال میں

میں اُردو ہوں

اُردو شاعری کی گیارہ آوازیں

ک شہر پانچ مشاہیر

حسرت کی سیاسی زندگی

نذرِ تخلص

تلاشِ آزاد

غالبیات

بمبئی سے بھوپال تک

ایک اور مشرقی کتب خانہ

حیاتِ ابوالکلام آزاد

مرتبہ

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

سرمایۂ ادب

(پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی مطبوعات کا اشاریہ)
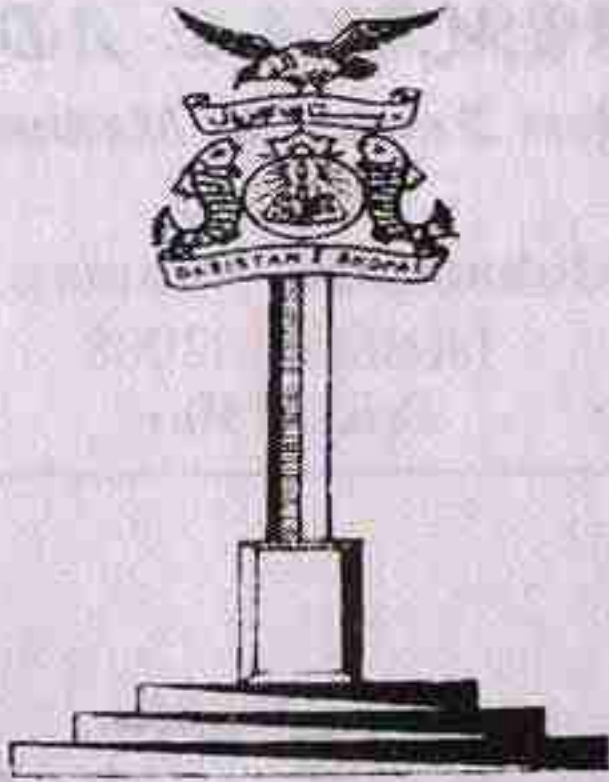
مرتّب

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

دبستانِ بھوپال، زیب ولا، A-79، گنتوری، بھوپال

نام کتاب : سرمایۂ ادب
(پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی مطبوعات کا اشاریہ)

مرتب : ڈاکٹر محمد نعمان خاں

سنہ اشاعت : ۲۰۰۸ء

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : سائرہ گرافکس پوائنٹ، جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

مطبع : نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی

ناشر : 'دبستانِ بھوپال'، زیب وِلا، گنوری، بھوپال، ۴۶۲۰۰۱

SARMAYA-E-ADAB

(Prof. Abdul Qavi Desnavi Ki Matbuaat Ka Ishariya)

Edited by

Dr. Mohammad Nauman Khan

Ist edition :2008

Price: 250/-

ملنے کے پتے:

☆103، قیصر منزل، تھرڈ فلور، لین نمبر ۳، نور نگر ایکسٹینشن (اوکھلا) نئی دہلی ـ 110025

☆'دبستانِ بھوپال'، زیب ولا، A-79، گنوری، بھوپال

☆نئی کتاب پبلشرس، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ـ 110025

انتساب

خارزارِ تحقیق میں گام فرسائی کرنے والے
نوجوان محققین کے نام

ترتیب

☆☆

اپنی بات

تحقیقی امور میں اشاریہ سازی کی اہمیت مسلّم ہے۔ اشاریے محققین کو متعلقہ موضوع پر ضروری معلومات اور وضاحتی مواد ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ انھیں تضیع اوقات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اشاریہ سازی کا کام بظاہر آسان نظر آتا ہے، لیکن اس کی حیثیت تحقیق سے کم نہیں ہے۔

اشاریے کو انگریزی میں INDEX کہا جاتا ہے۔ اردو میں اشاریے کی روایت انگریزی سے ہی آئی ہے۔ اردو میں اشاریہ سازی کے آغاز کا سہرا بشیر الحق دسنوی کے سر بندھتا ہے۔ پاکستان میں بعض ادبی اداروں کے علاوہ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اور ہندوستان میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی اور انجمن ترقی اردو ہند کے علاوہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مظفر حنفی نے مختلف موضوعات سے متعلق مطبوعات کے اشاریے مرتّب کر کے محققین کے لیے آسانیاں فراہم کردی ہیں۔

اشاریے کی افادیت کے پیشِ نظر بعض موقر ادبی جرائد کے اشاریے بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں 'اشاریہ آج کل' مرتبہ ڈاکٹر جمیل اختر، 'اشاریہ ایوانِ اردو' مرتبہ ڈاکٹر فاروق انصاری، 'اشاریہ دلگداز' مرتبہ محمد قمر سلیم، 'اشاریہ رسالہ جامعہ' مرتبہ ڈاکٹر فرزانہ خلیل اور 'نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ' مرتبہ ڈاکٹر دیوان حنّان خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اردو میں تحقیقی امور کو آسان اور بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اردو رسائل کے اشاریوں کے ساتھ ساتھ اہم ادیبوں کی مطبوعات کے اشاریے بھی مرتب کیے جائیں۔ وقت کی اس اہم ضرورت کے پیشِ نظر معروف محقق و نقاد پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تنقیدی، تحقیقی تحریروں/مطبوعات کے اشاریے کی ترتیب کا خیال میرے ذہن

میں آیا۔ زیر نظر اشاریہ اسی خیال کی عملی کوشش ہے۔ جس میں دسنوی صاحب کے سوانحی کوائف اور ان کی تحریروں/مطبوعات کی تفصیلات کے علاوہ ان سے متعلق بعض تبصرے اور خطوط بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی غرض سے بھوپال کے چند باذوق حضرات کی کوششوں سے ۲۰۰۰ء میں 'دبستانِ بھوپال' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس کے تحت ایک سہ ماہی جریدہ 'کاروانِ ادب' پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور بھوپال کے فنکاروں سے متعلق اکیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بائیسویں کتاب کے بطور یہ 'اشاریہ' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت میں 'دبستانِ بھوپال' کے روحِ رواں مکرمی کوثر صدیقی، برادرم پروفیسر خالد محمود اور جناب نعمانِ فاروقی کے مخلصانہ تعاون کے لیے میں بصمیم قلب ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد نعمان خاں
پروفیسر
ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
۱۵/مارچ ۲۰۰۸ء

شجرہ

پروفیسر سید سعید رضا

حسنیٰ بیگم

عفت آرا	پروفیسر عبدالحی رضا	عبدالقوی دسنوی	عبدالولی	فیضی بانو
شوہر سید رضا حسن	اہلیہ جہاں آرا	اہلیہ نجم النسا	اہلیہ صبیحہ بیگم	شوہر عطاء الرحمٰن
اولاد				
۱۔ ریاض حسن (رضی) ۲۔ شہناز بانو (شوہر ڈاکٹر فضل) ۳۔ عیاض حسن ۴۔ فیاض حسن	۱۔ نسرین جہاں (شوہر مسلم حیدر)	۱۔ عاتکہ دسنوی (شوہر محمد نعمان) ۲۔ عصمی دسنوی (شوہر عرفان رضا) ۳۔ علی متقی (اہلیہ صبیحہ بانو) ۴۔ علی نقی (اہلیہ رضوانہ) ۵۔ علی نواز (اہلیہ کوثر جہاں) ۶۔ عالیہ دسنوی (شوہر محمد جاوید) ۷۔ انجم دسنوی (شوہر محمد قسیم)	مسعود اختر (چاند) فرحان فریال	ضیاء الرحمٰن فیروز کنول شجاع الرحمٰن عباد الرحمٰن حمد الرحمٰن

سرگذشت

نام : عبدالقوی دسنوی

پیدائش : یکم نومبر ۱۹۳۰ء، دسنہ، نالندہ، صوبہ بہار

والد : سید سعید رضا (سابق پروفیسر وصدر شعبہ اردو فارسی، عربی سینٹ زیویرس کالج، بمبئی

والدہ : حسنیٰ بیگم

شریکِ حیات: نجم النساء دسنوی

بھائی : پروفیسر عبدالحی رضا، سید عبدالولی دسنوی

بہن : عفت آرا، فیضی بانو

اولاد : عاتکہ دسنوی، عصمی دسنوی، علی متقی، علی نقی، علی نواز، عالیہ دسنوی، انجم دسنوی

تعلیم:

☆ ابتدائی: مدرسۃ الاصلاح دسنہ (نالندہ)، بی۔این ریلوے ہائی اسکول، کھڑگپور (بنگال)، آرہ اسکول آرہ، شاہ آباد (بہار)

☆ کالج: سینٹ زیویرس کالج بمبئی، بی۔اے (آنرز) فرسٹ کلاس ۱۹۵۷ء

☆ ایم۔اے (اردو) فرسٹ کلاس ۱۹۵۹ء بمبئی یونیورسٹی بمبئی

زمانۂ تعلیم:

☆ مدیر: کاروانِ ادب/ شعبہ اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۱۹۵۱ء

☆ مہتمم: مدیر کاروانِ ادب، شعبہ اردو سینٹ زیویرس کالج، بمبئی ۱۹۵۴ء

☆ معاون رکن: کاروانِ ادب، شعبہ اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۱۹۵۷-۱۹۵۶ء

☆ سکریٹری: بزم ادب سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۱۹۵۶-۱۹۵۵ء

☆ میرٹ اسکالرشپ بمبئی یونیورسٹی (دو سال) ۱۹۵۷ـ۱۹۵۹ء

☆ فیلو اردو فارسی، سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۱۹۵۷ـ۱۹۵۸ء

☆ کنوینر انجمن نوجوان مصنفین کانفرنس، بمبئی ۲۱، ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۷ء

شبلی انعام:

نوجوان مصنفین کانفرنس بمبئی منعقدہ ۲۱، ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۷ء کے ادبی مقابلہ میں اول انعام

احمد سیلر ہائی اسکول کی ملازمت:

۱۹۶۰ء ۱۷ر فروری ۱۹۶۱ء تک

نگراں:

''شاہین'' میگزین احمد سیلر ہائی اسکول بمبئی ۱۹۶۰ء

کنوینر نمائش اخبار و رسائل سہ سالہ جشن شاعر بمبئی فروری ۳، ۴، ۵ ۱۹۶۱ء

مرتب مقالہ نما ''نوائے ادب'' سہ ماہی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

۱۹۵۹ـ۱۹۶۰ء

ملازمت شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال:

۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء سے یکم نومبر ۱۹۹۰ء تک

لیکچرار:

۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء سے ۲۰ر فروری ۱۹۶۵ء تک

اسسٹنٹ پروفیسر:

۲۱ر فروری ۱۹۶۵ء سے ۳۰ر جون ۱۹۶۸ء تک

پروفیسر:

یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے یکم نومبر ۱۹۹۰ء تک

اعزازی عہدے سیفیہ کالج بھوپال:

پروپرٹی افیسر چند سال، ایڈیشنل پرنسپل ۴ر جولائی ۱۹۸۳ء سے ۱۶ر اگست ۱۹۸۵ء تک

اعزازی عہدے برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال:

☆ چیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ اردو، فارسی و عربی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک

☆ چیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ اردو، فارسی و عربی ۱۹۸۴ء سے دسمبر ۱۹۸۵ء تک

☆ ڈین فیکلٹی آف آرٹس برکت اللہ یونیورسٹی جولائی ۱۹۸۰ء سے جون ۱۹۸۲ء تک

☆ ممبر ایگزیکیٹو کاونسل برکت اللہ یونیورسٹی ۱۹۸۰ء سے جون ۱۹۸۲ء تک

اعزازات:

☆ سینئر فیلوشپ وزارت تعلیم و ثقافت حکومتِ ہند دسمبر ۱۹۷۹ء تا نومبر ۱۹۸۳ء

☆ ممبر ترقی اردو بورڈ، دہلی، نومبر ۱۹۷۷ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک

☆ رکن پروگرام ایڈوائزری کمیٹی آل انڈیا ریڈیو، بھوپال نومبر ۱۹۷۸ء تا اکتوبر ۱۹۷۹ء

☆ رکن مجلس عام انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۹ - ۱۹۸۴ء

☆ میر اکیڈمی لکھنؤ کا ''امتیازِ میر'' ایوارڈ ۱۹۸۱ء

☆ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا صوبائی اعزاز نواب صدیق حسن خاں برائے تنقید ۸۷-۱۹۸۶ء

☆ مجموعی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۹-۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰-۱۹۸۹ء کا بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ پیش کیا گیا۔

☆ مجموعی اردو خدمات کے اعتراف میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا پرویز شاہدی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

کتابوں پر انعام:

۱۔	سات تحریریں	اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۲۔	اقبال انیسویں صدی میں	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۷۷ء
۳۔	مطالعہ خطوطِ غالب	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۷۹ء
۴۔	مطالعہ غبارِ خاطر	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۱ء
۵۔	اقبالیات کی تلاش	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۴ء
۶۔	یادگار سلیمان	مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ	۱۹۸۴ء
۷۔	ابوالکلام آزاد	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۷ء
۸۔	تلاشِ آزاد	اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۹۱ء
۹۔	تلاشِ آزاد	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۹۱ء

۱۰۔ تلاشِ آزاد — مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ — ۱۹۹۱ء

۱۱۔ اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ — ۱۹۹۳ء

۱۲۔ اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ — ۱۹۹۳ء

۱۳۔ معاصرین و متعلقات آزاد — اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ — ۱۹۹۶ء

۱۴۔ معاصرین و متعلقاتِ آزاد — بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، جنوری — ۲۰۰۳ء
(قاضی عبدالودود انعام)

سمینار

۱۔ اقبال صدی تقریبات: ۱۶/، ۱۷/، ۱۸/ نومبر ۱۹۷۹ء، شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی
مقالہ: اقبال کی نظم گوئی (۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک)

۲۔ چوتھا آل انڈیا جشن ظرافت پٹنہ: ۲۴/، ۲۵/ فروری — ۱۹۸۰ء
مقالہ: ''اکبر کا ظریفانہ کلام''

۳۔ آل انڈیا سمینار مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال — ۱۹۸۰ء
مقالہ: ''غالب صدی سے اقبال اور پریم چند صدی تک اردو تحقیق''

۴۔ یومِ اقبال: اقبال اکیڈمی، حیدرآباد ۱۸/ ۱۹/ ۲۰/ اپریل — ۱۹۸۰ء
مقالہ: ''اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری''

۵۔ آل انڈیا سمینار: حضرت خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی دہلی ۲۶/ اکتوبر — ۱۹۸۰ء
مقالہ: ''اقبال اور خواجہ حسن نظامی''

۶۔ چودھویں صدی ہجری سمینار: ملّی مشاورتی بورڈ، بھوپال — ۱۸/ جنوری ۱۹۸۱ء
مقالہ: ''چودھویں صدی ہجری میں اردو کے ذریعہ دین کی خدمت''

۷۔ جشن صد سالہ حسرت موہانی، مونگیر بہار — ۱۱/ اپریل ۱۹۸۲ء
مقالہ: ''سید فضل الحسن حسرت موہانی پہلی بار قید فرنگ میں''

۸۔ اکبر الہ آبادی سمینار: بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ — ۱۰/ ۱۱/ اپریل ۱۹۸۳ء
مقالہ: ''اکبر الہ آبادی کا زمانہ فن اور ان کی غزل گوئی کا اولین دور''

۹۔ صد سالہ تقریبات ولادت علامہ سید سلیمان ندوی، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ
مقالہ: ''سید سلیمان ندوی کا اردو کلام'' ۱ر، ۲ر، ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء

۱۰۔ بزم سلیمان دار العلوم تاج المساجد، بھوپال، ۴ر، ۵ر، ۶ر ستمبر ۱۹۸۵ء
مقالہ: ''مولانا سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال''

۱۱۔ تقریبات یوم حالی، ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی، چنڈی گڑھ ۲۳، ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء
مقالہ: ''محب وطن حالی''

۱۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد صد سالہ تقریبات، بہار اردو کیڈمی پٹنہ ۲۹۔ ۳۰ نومبر ۱۹۸۷ء
مقالہ: ''آزاد کے صحافتی سفر کی پہلی منزل: لسان الصدق''

۱۳۔ اقبال سمینار آل انڈیا اقبال ادبی مرکز بھوپال ۱۱، ۱۲ر نومبر ۱۹۸۸ء
مقالہ: ''اقبال اور ان کے ایک جلیل القدر ہم عصر ابوالکلام آزاد''

۱۴۔ یوم آزاد مذاکرہ: گجرات اردو اکیڈمی و مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بڑودہ، ۲۵ر فروری
مقالہ: ''مولانا آزاد پہلی بار قید فرنگ میں'' ۱۹۸۹ء

۱۵۔ مولانا آزاد سمینار: اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۲۲، ۲۳، ۲۴ر جون ۱۹۸۹ء
مقالہ: ''مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے نامور ہم عصر مولانا سید سلیمان ندوی''

۱۶۔ کل ہند سمینار قاضی عبدالودود حیات اور خدمات: بہار اردو اکیڈمی پٹنہ
۲۴، ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۹ء

مقالہ: ''قاضی عبدالودود اور سہ ماہی نوائے ادب بمبئی''

۱۷۔ دوسرا مولانا محمد علی جوہر میموریل لیکچر، محمد علی لائبریری کلکتہ ۲۷ر اپریل ۱۹۹۱ء
موضوع: ''مولانا محمد علی جوہر اور ان کے نامور ہمعصر مولانا ابوالکلام آزاد''

۱۸۔ یاد محوی سمینار، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۹۲ء
موضوع: ''مولانا محوی صدیقی: ایک تعارف''

۱۹۔ مجروح سلطانپوری اور ان کا ادبی سفر، کل ہند سمینار
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی ۱۴ر جنوری ۱۹۹۵ء
موضوع: ''مجروح سلطانپوری کا شعری سفر اور ترقی پسند تحریک''

(اعتراضات، ردِ عمل، شکایتیں)

۲۰۔ سرسید ڈے سمینار، بھوپال ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۵ء

موضوع: ''سرسید تحریک اور آج کے تقاضے''

۲۱۔ سمینار مولانا آزاد اکیڈمی، اندور ۲۱/نومبر ۱۹۹۵ء

موضوع: ''مولانا آزاد کیوں یاد آتے ہیں''

۲۲۔ سمینار غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۲۲، ۲۳، ۲۴/دسمبر ۱۹۹۵

موضوع: ''مداح غالب عبدالرحمٰن بجنوری اور ناقدین کا رویہ''

۲۳۔ مغربی تہذیب، انحطاط اور علاج از مولانا حبیب ریحان ندوی ازہری کا اجراء

دارالتصنیف و ترجمہ بھوپال ۲۸/مارچ ۱۹۹۷ء

موضوع: ''کچھ مغربی تہذیب، انحطاط اور علاج کے بارے میں''

۲۴۔ علامہ اقبال سمینار، کل ہند اقبال مرکز، بھوپال ۹/نومبر ۱۹۹۸ء

موضوع: ''سرسید احمد خاں اور ان کا ایک عقیدت مند اقبال''

۲۵۔ اسٹاف ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ آل انڈیا ریڈیو، دہلی، مقام آل انڈیا ریڈیو بھوپال

۴/ستمبر ۱۹۸۹ء

موضوع: ''اردو زبان: مشترکہ تہذیب اور جذباتی ہم آہنگی کی نمائندہ''

اردو ورکشاپ

☆ ورکشاپ برائے تیاری نصاب اور نصابی کتب جماعت اول تا یازدہم

این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی

اس سلسلہ میں مختلف وقتوں میں سری نگر، دہلی، بنگلور اور میسور میں منعقدہ ورکشاپ میں شرکت کی۔

سیفیہ کالج کے طلباء جنھیں دسنوی صاحب کی زیرِ نگرانی

برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی

۱۔	ڈاکٹر مظفر حنفی	موضوع: شاد عارفی شخصیت اور فن	۱۹۷۴ء
۲۔	ڈاکٹر حدیقہ بیگم	موضوع: عبدالرحمٰن بجنوری حیات اور خدمات	۱۹۸۱ء
۳۔	ڈاکٹر نسیم شبنوی	موضوع: اردو تنقید کا مارکسی دبستان	۱۹۸۱ء
۴۔	ڈاکٹر محمد ایوب خاں	موضوع: اقبال اور اردو غزل	۱۹۸۲ء
۵۔	ڈاکٹر صفیہ ودود	موضوع: تخلص بھوپالی حیات اور خدمات	۱۹۸۴ء
۶۔	ڈاکٹر ارجمند بانو	موضوع: ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو	۱۹۸۹ء
۷۔	ڈاکٹر شان احمد فخری	موضوع: سرونج کی ادبی خدمات	۱۹۹۰ء
۸۔	ڈاکٹر یعقوب علی خاں (یعقوب یاور)	موضوع: ترقی پسند شاعری ایک جائزہ	۱۹۹۰ء
۹۔	ڈاکٹر محمد نعمان	موضوع: بھوپال میں اردو — انضمام کے بعد	۱۹۹۰ء

حسب ذیل مقالے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔	شاد عارفی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	۱۹۷۷ء
۲۔	نقد بجنوری (مقالہ ایک حصہ)	ڈاکٹر حدیقہ بیگم	۱۹۸۴ء
۳۔	تخلص بھوپالی حیات اور خدمات	ڈاکٹر صفیہ ودود	۱۹۹۳ء
۴۔	ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	ڈاکٹر یعقوب یاور	۱۹۹۷ء
۵۔	سرونج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر شان احمد فخری	۱۹۹۹ء
۶۔	بھوپال میں اردو — انضمام کے بعد	ڈاکٹر محمد نعمان	۲۰۰۶ء

☆☆
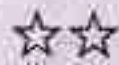
اشاریہ

مطبوعات

تحقیق وتنقید

۱۔	ایک اور مشرقی کتب خانہ	جمعیۃ الطلباء، وسنہ پٹنہ	۱۹۵۴ء
۲۔	حسرت کی سیاسی زندگی (چند جھلکیاں) حلقہ احباب، وسنہ، پٹنہ		۱۹۵۶ء
۳۔	علامہ اقبال بھوپال میں	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۷ء
۴۔	بھوپال اور غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۹ء
۵۔	نسخۂ بھوپال ونسخۂ بھوپال ثانی	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۰ء
۶۔	ایک شہر پانچ مشاہیر	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۷۔	مطالعہ خطوطِ غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۵ء
۸۔	سات تحریریں	اردو پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۹۔	تلاش وتاثر	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۱۰۔	مہدی حسن افادی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۱۱۔	اقبال انیسویں صدی میں	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۱۲۔	اقبال اور ولی	نئی آواز، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۱۳۔	مطالعہ خطوطِ غالب مع اضافہ	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۹ء
۱۴۔	مطالعہ غبارِ خاطر	نئی آواز، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۱۵۔	اقبال اور دارالاقبال بھوپال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۱۶۔	اقبالیات کی تلاش	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
☆	اقبالیات کی تلاش	گلوب پبلشر، اردو بازار، لاہور	۱۹۸۵ء
۱۷۔	ابوالکلام آزاد (اردو)	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی	۱۹۸۷ء
☆	ابوالکلام آزاد (ہندی) مترجم: جانی پرشاد شرما، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی		۱۹۸۸ء

☆ ابوالکلام آزاد (پنجابی) مترجم: اندر سنگھ راز، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۸۸ء
☆ ابوالکلام آزاد (انگریزی) مترجم: سیدہ سیدین حمید، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۹۱ء
☆ ابوالکلام آزاد (میتھلی) مترجم: فضل الرحمٰن ہاشمی، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۱۸۔	مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ		۱۹۸۸ء
۱۹۔	تلاشِ آزاد	مہاراشٹر اردو اکیڈمی مکمل مالی تعاون سے	۱۹۹۰ء
۲۰۔	متاعِ حیات	ناشر: مصنف	۱۹۹۰ء
۲۱۔	اجنبی شہر	ناشر: مصنف	۱۹۹۲ء
۲۲۔	اردو شاعری کی گیارہ آوازیں	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۹۳ء
۲۳۔	معاصرین ومتعلقاتِ آزاد	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۹۶ء
۲۴۔	حیاتِ ابوالکلام آزاد	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۰ء
۲۵۔	بمبئی سے بھوپال تک	ناشر مصنف	۲۰۰۴ء
۲۶۔	میں اردو ہوں	ناشر مصنف	۲۰۰۶ء

ترتیب وتدوین:

۱۔	اور ہندوستان جاگ اٹھا	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۳ء
۲۔	مضامین لسان الصدق	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۳۔	قادر نامۂ غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۱ء
۴۔	نذرِ سجاد	سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۴ء
۵۔	مرزا سلامت علی دبیر	ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۶۔	بچوں کے اقبال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۷۔	مکاتیب عبدالحق بنام محوی	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۱۹۸۰ء
۸۔	نذرِ تخلص	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۹۔	ارمغان سیفیہ (بہ اشتراک ڈاکٹر محمد نعمان) شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال		۱۹۸۶ء
۱۰۔	ماہنامہ لسان الصدق، کلکتہ	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۸ء

۱۱۔ ہفتہ وار پیغام، کلکتہ (نگراں مولانا ابوالکلام آزاد) خدا بخش لائبریری، پٹنہ
تقدیم ثانی: عبدالقوی دسنوی ۱۹۸۹ء

۱۲۔ جواہرِ آزاد (بہ اشتراک ڈاکٹر محمد نعمان) ۱۹۹۰ء

۱۳۔ فخر نامہ (بہ اشتراک ڈاکٹر محمد نعمان) سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۹۷ء

اشاریے

۱۔	غالبیات	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۲۔	انیس نما	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۳ء
۳۔	ہندوستان میں اقبالیات	اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور	۱۹۷۶ء
۴۔	دھنپت رائے نواب رائے، پریم چند	کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۵۔	دھنپت رائے نواب رائے، پریم چند	نگار، کراچی اگست	۱۹۸۵ء
۶۔	یادگارِ سلیمان	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۴ء
۷۔	یادگارِ آزاد	اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۸ء

رسائل کے خاص نمبروں میں شامل تحریریں:

۱۔ دینی تعلیمی نمبر، البلاغ، بمبئی علامہ سلیمان ندوی، دسمبر ۱۹۵۴، فروری ۱۹۵۵ء

۲۔ آزاد نمبر اردوادب علی گڑھ لسان الصدق ۱۹۵۹ء

۳۔ غالب نمبر ۲ اردوئے معلی، دہلی یونیورسٹی دہلی۔ غالب نما بہ اشتراک ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۹۶۱ء

۴۔ عبدالحق نمبر قومی زبان، کراچی محوی صدیقی ۱۹۶۷ء

۵۔ ندوی نمبر سب رس حیدرآباد دکن نجیب اشرف ندوی ۱۹۶۸ء

۶۔ غالب نمبر ۱ اردوادب علی گڑھ مخانہ جاوید اور غالب ۱۹۶۹ء

۷۔ غالب نمبر جامعہ، نئی دہلی مولانا عباس رفعت ۱۹۶۹ء

۸۔ غالب نمبر شاعر، بمبئی یار محمد خاں شوکت ۱۹۶۹ء

۹۔ غالب نمبر ۱ نقوش، لاہور غالب کے خلاف ایک کتاب کا تعارف ۱۹۶۹ء

۱۰۔ غالب نمبر اردو، کراچی ابوالفضل محمد عباس رفعت شیروانی ۱۹۶۹ء

۱۱۔ غالب نمبر ادبِ لطیف، لاہور غالب کا ایک شاگرد یار محمد خاں شوکت ۱۹۶۹ء

۱۲۔ غالب نمبر نئی قدریں حیدرآباد پاکستان غالب اور اپریل فول ۱۹۶۹ء

۱۳۔ غالب نمبر نیا دور، لکھنؤ غالب اور بھوپال ۱۹۶۹ء

۱۴۔ غالب نمبر آج کل، دہلی انشائے نورچشم ۱۹۶۹ء

۱۵۔ غالب نمبر سب رس، حیدرآباد ہاشمی اور نسخہ حمیدیہ ۱۹۶۹ء

۱۶۔ غالب نمبر مجلہ سیفیہ، بھوپال نسخۂ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی ۷۰-۱۹۶۹ء

۱۷۔ غالب نمبر ۳ نقوش، لاہور قادر نامہ، بیاضِ غالب، نسخہ بھوپال ثانی ۱۹۷۱ء

۱۸۔ احتشام نمبر آہنگ گیا (۱) احتشام حسین (۲) نگارات احتشام جولائی ۱۹۷۳ء

۱۹۔ احتشام حسین نمبر، فروغِ اردو، لکھنؤ احتشام صاحب کے دیباچے، فروری ۱۹۷۳ء

۲۰۔ جاں نثار نمبر فن اور شخصیت، بمبئی جاں نثار کی غزلیں ۱۹۷۶ء

۲۱۔ کرشن چندر نمبر، ماہنامہ شاعر، بمبئی۔ کرشن چندر کی یاد مارچ اپریل ۱۹۷۷ء

۲۲۔ چکبست نمبر فروغ اردو، لکھنؤ چکبست کی نظم گوئی ۱۹۷۷ء

۲۳۔ اقبال نمبر ۱ نقوش، لاہور حیات اقبال ستمبر ۱۹۷۷ء

۲۴۔ دبیر نمبر کتاب نما، دہلی، ستمبر مرزا سلامت علی دبیر اور دبیریات ۱۹۷۷

۲۵۔ اقبال نمبر ۲ نقوش، لاہور (۱) بچوں کے اقبال

(۲) اقبال کا بھوپال سے تعلق دسمبر ۱۹۷۷ء

۲۶۔ عبدالماجد دریا آبادی نمبر نیا دور لکھنؤ

مولانا عبدالماجد مہدی افادی کی نظر میں اپریل ۱۹۷۸ء

۲۷۔ اقبال نمبر اردو ادب، دہلی ہندوستان میں اقبالیات ۱۹۷۹ء

۲۸۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر، شاعر، بمبئی حیات خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۹۸۰ء

۲۹۔ یادگار اقبال: کچھ اقبال، دارالاقبال اور سیفیہ کالج بھوپال کے بارے میں

مجلہ سیفیہ، بھوپال ۱۹۸۰ء

۳۰۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نمبر، آج کل، نئی دہلی اقبال اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری، جنوری ۱۹۸۱ء

۳۱۔ فیض نمبر فن اور شخصیت، بمبئی فیض کی شاعری: ایک جائزہ ۱۹۸۲ء

۳۲۔ قتیل شفائی نمبر، فن اور شخصیت، بمبئی ایک خط ایک خوشبو جون ۱۹۸۲ء

۳۳۔ فراق نمبر نیا دور، لکھنؤ فراق ایک قابل قدر دانشور ایک عظیم شاعر

مارچ مئی ۱۹۸۳ء

۳۴۔ علامہ محوی صدیقی نمبر، اسباق، پونا مولانا محوی صدیقی ۱۹۸۳ء

۳۵۔ فراق نمبر اردو ادب، دہلی مکتوب نگار فراق ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۴ء

۳۶۔ صحافت نمبر ۲ آجکل، دہلی دسمبر مولانا آزاد اور ہفتہ وار پیغام ۱۹۸۴ء

۳۷۔ سالنامہ نقوش، لاہور مکتوب نگار فراق جون ۱۹۸۵ء

۳۸۔ ساحر نمبر فن اور شخصیت، بمبئی ساحر، تلخیاں، پرچھائیاں ۱۹۸۵ء

۳۹۔ اکبر، اقبال نمبر، شگوفہ حیدرآباد، دکن اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اپریل ۱۹۸۶ء

۴۰۔ مجروح سلطانپوری نمبر (مجروح ایک منفرد غزل گو) چراغ، بمبئی ۱۹۸۷ء

۴۱۔ محمد طفیل نمبر نقوش، لاہور (۱) نقوش مکاتب وخطوط نمبر جولائی ۱۹۷۸ء

(۲) محمد طفیل اور نقوش عکس اور شخص طلوع کی روشنی میں

۴۲۔ یادرفتگاں نمبر حصہ اول، نیا دور، لکھنؤ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کچھ یادیں کچھ تحریریں

اپریل تا ستمبر ۱۹۸۸ء

۴۳۔ گنیش بہاری طرز نمبر، فن اور شخصیت، بمبئی گنیش بہاری طرز ستمبر ۱۹۸۸ء

۴۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ایوانِ اردو، دہلی آزاد وادیٔ صحافت میں ۱۹۰۸ تک

دسمبر ۱۹۸۸ء

۴۵۔ ابوالکلام آزاد نمبر، روحِ ادب، کلکتہ ابوالکلام آزاد کی شاعری ۱۹۹۰ء

۴۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، نیا دور، لکھنؤ مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی سفر، پہلی گرفتاری تک

۴۷۔ کیفی اعظمی نمبر معیار، دہلی کیفی اعظمی ایک شاعر، ایک مشفق، ایک بھائی

۱۹۹۲ء

۴۸۔ فیسٹول نمبر آبشار، کلکتہ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ستمبر ۱۹۹۲ء

۴۹۔ فیسٹول نمبر　　آبشار، کلکتہ　　مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی نمائندہ

اکتوبر ۱۹۹۳ء

۵۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ا، دو ماہی اکیڈمی، لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ایک نامور ہمعصر سید سلیمان ندوی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء

۵۱۔ جذبی نمبر　　آج کل، دہلی　　جذبی کا شعری سفر　　اگست ۱۹۹۴ء

۵۲۔ اودھ نمبر حصہ دوم، نیا دور، لکھنؤ　　اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری

اکتوبر نومبر ۱۹۹۵ء

۵۳۔ نصف صدی نمبر، نیا دور، لکھنؤ　　بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی، مارچ، مئی ۱۹۹۵ء

۵۴۔ مجروح سلطانپوری نمبر، نوائے ادب، بمبئی، مجروح سلطانپوری کا شعری سفر اور ترقی پسند تحریک

اکتوبر ۱۹۹۵ء

۵۵۔ خواجہ احمد فاروقی نمبر، ہماری زبان، دہلی　　خواجہ احمد فاروقی منفرد شخص، محترم استاد، خادمِ اردو

یکم و ۸ نومبر ۱۹۹۶ء

۵۶۔ آبشار، خاص نمبر (کلکتہ)　　سرسید تحریک اور آج کے تقاضے　　۱۹۹۶ء

۵۷۔ گجرات نمبر　　گلبن، احمد آباد　　سہ ماہی نوائے ادب اور گجرات، جنوری، اپریل ۱۹۹۷ء

۵۸۔ خاص نمبر　　فن اور شخصیت　　جیتا جاگتا شاعر (صابر دت) اگست ۱۹۹۷ء

۵۹۔ خاص نمبر　　آبشار، کلکتہ　　آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کی رفتار ۱۹۹۷ء

۶۰۔ ظفر گورکھپوری نمبر، انتساب، سرونج　　ظفر گورکھپوری اپنی غزلوں کی روشنی میں ۱۹۹۸ء

۶۱۔ ڈاکٹر خالد محمود نمبر، انتساب، سرونج　　خالد محمود　　ستمبر ۱۹۹۸ء

۶۲۔ سالنامہ نقوش، لاہور　　یادِ عزیز مہربان (محمد طفیل مرحوم) شمارہ ۱۳۹

۶۳۔ آبشار کلکتہ خاص نمبر　　اکیسویں صدی کی آمد اور ہمارا وطن　　۲۰۰۰ء

۶۴۔ کوثر صدیقی، فن اور شخصیت نمبر　　اسباق، پونا　　اپریل تا جون ۲۰۰۰ء

(کوثر صدیقی نالۂ جرس کی روشنی میں)

۶۵۔ علی گڑھ نمبر سہ ماہی فکر و آگہی دہلی　　سرسید احمد خاں اور ان کا ایک عقیدت مند اقبال

۲۰۰۰ء

۶۶۔ مجروح سلطانپوری نمبر نوائے ادب، بمبئی جنوری مارچ ۲۰۰۱ء

(مجروح سلطانپوری کا شعری سفر اور ترقی پسند تحریک)

۶۷۔ ایوب واقف نمبر، انتساب، سرونج محمد ایوب واقف ''تعبیر و تشریح کے دریچے سے''

۶۸۔ اسلم بدر نمبر سہ ماہی ''وقت'' دھبناد، شمارہ ۶ کچھ اسلم بدر کی شاعری کے بارے میں ۲۰۰۴ء

۶۹۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نمبر، ہماری زبان، دہلی (پروفیسر جگن ناتھ آزاد: ایک مطالعہ)

۸ تا ۱۴/ اپریل ۲۰۰۵ء

۷۰۔ ارمغان اختر سعید خاں اختر سعید خاں نظم اور غزل کے محترم شاعر

سہ ماہی فکر و آگہی ڈاکٹر رضیہ حامد، جلد ۱۹ ۲۰۰۵ء

۷۱۔ مشفق خواجہ نمبر ہماری زبان، دہلی ہمارے مشفق خواجہ نہیں رہے

۸ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵

کتابوں میں مضامین

۱۔ دادا نذر سجاد سیفیہ کالج بھوپال ۱۹۷۴ء

۲۔ محسن اعظم نذر سجاد سیفیہ کالج بھوپال ۱۹۷۴ء

۳۔ مطالعہ خطوطِ غالب نذر سجاد سیفیہ کالج بھوپال ۱۹۷۴ء

۴۔ مولانا محوی صدیقی بچوں کے شاعر معیار ادب بکڈپو، بھوپال ۱۹۷۶ء

۵۔ ہندوستان میں اقبالیات، اقبال پر کچھ مضامین، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۷۹

۶۔ اکبر الہ آبادی کا زمانہ: فن اور ان کی غزل گوئی کا اولین دور

اکبر الہٰ آبادی بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ ۱۹۸۴ء

۷۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال

مطالعہ سلیمان دارالعلوم، تاج المساجد، بھوپال ۱۹۸۶ء

۸۔ اقبال کی اردو غزل گوئی ۱۹۰۵ء تک

رموزِ اقبال شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

۹۔ مالک رام اور ابوالکلام آزاد مالک رام ایک مطالعہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۱۰۔ محبِ وطن حالی | حالی فن اور شخصیت | ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ ۱۹۸۶ء

۱۱۔ تسبیح روز و شب | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۲۔ جانے والے کی یاد آتی ہے | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۳۔ تم سلامت رہو | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۴۔ اردو زبان سیفیہ کالج اور بھوپال | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۵۔ ایک یادگار سپاس نامہ (فیض کی سیفیہ کالج میں آمد پر)

ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۶۔ سیفیہ کالج، عزیز طلبا اور میں | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۷۔ استقبالیہ | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۸۔ قیامت صغریٰ (دو خط) | ارمغانِ سیفیہ | شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۹۔ ذاکر صاحب باتیں اس کی یاد آتی ہیں، نقشِ ذاکر | مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

۲۰۔ سید سلیمان ندوی کا اردو کلام | علامہ سلیمان ندوی | بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ ۱۹۸۸ء

۲۱۔ آزاد کے صحافتی سفر کی پہلی منزل، ابوالکلام آزاد | بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ ۱۹۸۹ء

۲۲۔ اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری، اقبال کے شعری اسالیب، ڈاکٹر عبدالحق ۱۹۸۹ء

۲۳۔ مالک رام اور تحقیقی جہات | مالک رام | غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۹۱ء

۲۴۔ خطوط شاد عارفی | شاد عارفی ایک مطالعہ، مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۹۹۱ء

۲۵۔ کیفی اعظمی: ایک شاعر ایک مشفق، ایک بھائی (کیفی اعظمی عکس اور جہتیں)

مرتبہ شاہد ماہلی ۱۹۹۲ء

۲۶۔ نثار احمد فاروقی: میرے غالب شناسی تک

پروفیسر نثار احمد فاروقی شخصیت اور ادبی خدمات ۱۹۹۳ء

۲۷۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد | مجلس اقبال حصہ سوم، مرتبہ آفاق احمد | مارچ ۱۹۹۳ء

۲۸۔ اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری، اودھ آئینۂ ایام میں، مرتبہ سید امجد حسین مارچ ۱۹۹۶ء

۲۹۔ قاضی عبدالودود اور سہ ماہی نوائے ادب

قاضی عبدالودود سیمنار کے مقالے | بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ ۱۹۹۶ء

۳۰۔فراق نظم گوئی کے میدان میں فراق صدی کی آواز دسمبر ۱۹۹۶ء

۳۱۔مداح غالب عبدالرحمٰن بجنوری تنقیدات مرتبہ پروفیسر نذیر احمد ۱۹۹۷ء

۳۲۔سید سلیمان ندوی وادیٔ شعر میں، ارمغانِ علمی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ۱۹۹۹ء

۳۳۔وجاہت علی سندیلوی وادی شاعری میں، وجاہت علی سندیلوی، مرتبہ ظفر احمد غازی ۲۰۰۰ء

۳۴۔نشور واحدی ایک منفرد غزل گو

اشک چکاں سے عصر رواں تک نشور واحدی مرتب: نیاز احمد واحدی ۲۰۰۰ء

۳۵۔ایک منفرد غزل گو (مجروح سلطانپوری) مجروح سلطانپوری مقام اور کلام

مرتبہ: ڈاکٹر محمد فیروز ۲۰۰۰ء

۳۶۔سرسید احمد خاں اور ان کا ایک عقیدت مند اقبال، مجلس اقبال حصہ ہفتم، بھوپال، جنوری ۲۰۰۰ء

۳۷۔اور بستی نہیں یہ دلّی ہے نذر رفعت سروش مرتبہ: ڈاکٹر شبانہ نذیر ۲۰۰۱ء

۳۸۔رفعت سروش شہر غزل میں نذر رفعت سروش مرتبہ: ڈاکٹر شبانہ نذیر ۲۰۰۱ء

۳۹۔ایک مراسلہ شاخ گل کے حوالے سے، نذر رفعت سروش، مرتبہ: ڈاکٹر شبانہ نذیر ۲۰۰۱ء

۴۰۔کالی داس گپتا رضا، معتبر شاعر، محترم محقق، انسان دوست، عاشق اردو ۲۰۰۱ء

"محقق غالب، کالی داس گپتا رضا"، مرتبین: عارف خاں، ثاقب صدیقی ۲۰۰۱ء

۴۱۔ مناظر عاشق ہرگانوی اور داستانِ غم کا سلسلہ: مناظر عاشق ہرگانوی بحیثیت شاعر

مرتبہ: ڈاکٹر نیر حسن نیر ۲۰۰۱ء

۴۲۔دارالمصنفین، مولانا عبدالسلام ندوی اور اقبال کامل

مقالات مولانا عبدالسلام ندوی حیات اور ادبی فتوحات مرتب: محمد ہارون ۲۰۰۱ء

۴۳۔منمو بن طالب اور ان کا شعری مجموعہ "کلیاں اور پھول"

سخن کار: مرتبین: اختر وامق، بدر واسطی، آنند تارن، خورشید اختر ۲۰۰۲ء

۴۴۔علقمہ شبلی کی ابتدائی غزلیں، علقمہ شبلی، خوابوں کا صورت گر، مرتب راشد انور راشد ۲۰۰۳ء

۴۵۔ارشد صدیقی کا ابتدائی شعری سفر: ارشد صدیقی ایک مطالعہ ۲۰۰۴ء

مرتبین: نصیر پرواز، رشید انجم

۴۶۔محمد علی تاج: شخص اور شاعر سیف وسبو، مرتبہ کوثر صدیقی، دبستان، بھوپال ۲۰۰۵ء

۴۷۔غالبیات اور ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر مختار الدین احمد (محقق اور دانشور)

مرتبہ: شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

۴۸۔ بنام رہبر جونپوری (ایک خط) ''اعتبار'' (رہبر جونپوری کی شخصیت اور شاعری)

مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد، بھوپال ۲۰۰۵ء

۴۹۔ اردو کا ایک باعمل فنکار: سیفی سرونجی ''سیفی سرونجی: شخصیت اور فن''

مرتبہ: محمد توفیق خاں، سرونج ۲۰۰۵ء

۵۰۔ نادم بلخی کی غزل گوئی ذکر نادم بلخی مرتب: ڈاکٹر سید حسن عباس، سیوان

۵۱۔ آہ ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی رخصت ہوئے ''صاحب فکر و نظر ڈاکٹر ابو محمد سحر''

مرتبین: کوثر صدیقی، مختار شمیم بھوپال ۲۰۰۶ء

۵۲۔ اقبال سچا محب وطن اور انسان دوست، مطبوعہ: مجلس اقبال گیارہویں جلد

اقبال ادبی مرکز، بھوپال ۲۰۰۶ء

۵۳۔ خالد عابدی ایک سادہ لیکن باعمل شخص ''محمد خالد عابدی ایک مطالعہ''

مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد، رہبر جونپوری ۲۰۰۷ء

۵۴۔ یادِ اقبال مجلس اقبال، حصہ ۱۲، اقبال مرکز، بھوپال

۵۵۔ جوہر کی شاعری، ترانہ بیداری کی روشنی میں، بی۔ ایس۔ جین جوہر: فن اور شخصیت

مرتبہ ڈاکٹر خالد حسین خاں، نرالی دنیا پبلیکیشن، دہلی ۲۰۰۷

تعارف، پیش لفظ، تاثرات، خطوط

۱۔ تاثر گل تو واحدی پریمی ۱۹۶۷ء

۲۔ بازگشت (تعارفی خاکہ) نئی نسل کی نئی غزل از متین سید ۱۹۷۳ء

۳۔ پیش لفظ ہفت رنگ شاہد میر ۱۹۸۱ء

۴۔ پیش لفظ مطالعات نسیم شہنوی ۱۹۸۱ء

۵۔ تعارف سمندر آشنا خالد محمود ۱۹۸۲ء

۶۔ پیش لفظ پھلواری حافظ عبدالرزاق باقوی ۱۹۸۲ء

۷۔ قتیل شفائی نمبر کے بارے میں (خط)

نرگس دست نمبر فن اور شخصیت، بمبئی ۸۳-۱۹۸۲

۸۔ تعارف　　نقد بجنوری　　حدیقہ بیگم　　۱۹۸۴ء

۹۔ رسول نمبر نقوش (۲ خط)　　رسول نمبر ۱۳ (نقوش لاہور)　　جنوری ۱۹۸۵ء

۱۰۔ تجزیہ ڈریگون　　سورج مکھی　　شام بارکپوری، بنگلہ دیش نومبر ۱۹۸۶ء

۱۱۔ پیش لفظ　　ڈاکٹر مظفر حنفی　　ڈاکٹر محبوب راہی　　۱۹۸۶ء

۱۲۔ پیش لفظ　　رقص نوا　　نصرت صدیقی　　۱۹۸۸ء

۱۳۔ تاثرات　　نوائے مقبول　　نیاز قومی　　دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۴۔ کچھ ہفتہ وار پیغام کے بارے میں، ہفتہ وار پیغام　　خدا بخش لائبریری، پٹنہ　　۱۹۸۹ء

۱۵۔ ایک خط بنام شمس الحق عثمانی　　محب وطن پریم چند اور دیگر مضامین

شمس الحق عثمانی　　مارچ ۱۹۸۹ء

۱۶۔ ایک خط بنام ظفر گورکھپوری　　چراغ چشم تر　　ظفر گورکھپوری　　دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۷۔ تعارف　　امروز　　یعقوب یاور　　۱۹۹۰ء

۱۸۔ ایک خط بنام کاظم علی خاں　　آغا جو شرف　　کاظم علی خاں　　۱۹۹۰ء

۱۹۔ بات نثار راہی کی (پیش لفظ)　　پت جھڑ کی آواز　　نثار راہی　　۱۹۹۴ء

۲۰۔ وفا کی باتیں　　نقشِ وفا　　وفا صدیقی　　ستمبر ۱۹۹۴ء

۲۱۔ پیش لفظ　　دیار یار کی باتیں　　لطف اللہ خاں نظمی　　۱۹۹۴ء

۲۲۔ کچھ مصنف کے بارے میں　　اسلامی تاریخ کی کچھ کہانیاں، مجوی صدیقی، دسمبر ۱۹۹۵ء

۲۳۔ کوثر صدیقی کی بچوں کی شاعری　　پھول ایک ہی چمن کے، کوثر صدیقی　　۱۹۹۵ء

۲۴۔ کچھ صابر آروی کی شاعری کی باتیں　　متاعِ احساس　　صابر آروی　　جنوری ۱۹۹۶ء

۲۵۔ بات خالد عابدی کی　　اردو مراسلاتی انٹرویو، خالد عابدی　　۱۹۹۶ء

۲۶۔ کچھ کوثر صدیقی کی شاعری کے بارے میں

فصیلِ شب　　کوثر صدیقی　　۱۹۹۷ء

۲۷۔ محمد مسعود خاں اختر وادی شاعری میں آئینۂ فکر　　مسعود علی خاں اختر　　۱۹۹۷ء

۲۸۔ بات نثار راہی کے افسانوں کی　　رائفل　　نثار راہی　　۱۹۹۸ء

۲۹۔ سروش کی شاعری پر ایک نظر　　اجالوں کی رہگذر　　سریش پرساد سروش　　۱۹۹۸ء

۳۰۔ امتیازِ انجمؔ	خوشبو کی آنچ	امتیاز انجم، بھوپال	۲۰۰۰ء
۳۱۔ لاگ لپیٹ کے بغیر	کتاب نما	مظفر حنفی	دسمبر ۲۰۰۲ء
۳۲۔ کچھ دشت الم ہے بیکراں کے بارے میں	دشتِ الم ہے بیکراں، اظہر ندوی		۲۰۰۳ء
۳۳۔ ایک تاثر	پہلا قدم	سید اختر حسن (ماسٹر اختر)	۲۰۰۳ء
۳۴۔ پیش لفظ	کشور افکار	زبیر ارتضیٰ ڈھاکہ	اگست ۲۰۰۳ء
۳۵۔ متاعِ قلم: میری نظر میں	متاعِ قلم	ابرار نغمی	۲۰۰۴ء
۳۶۔ برادرِ عزیز عطاء الرحمٰن جمیل	دور دیس سے	عطاء الرحمٰن جمیل، ڈھاکہ	جنوری ۲۰۰۵ء
۳۷۔ پروفیسر منظر حسن ایک محترم شاعر	یادوں کی دہلیز	سید منظر حسن	۲۰۰۵ء

رسائل واخبارات میں شامل تحریریں

ابلاغ (رانچی) (ششماہی):

۱۔ غالب صدی سے اقبال اور پریم چند صدی تک، اردو تحقیق، شمارہ ۱، جلد ۱ ۱۹۸۱ء

اثبات ونفی (کلکتہ) سہ ماہی:

۲۔ غالب اور حسن وعشق	اکتوبر	۱۹۹۵ء

آج کل (دہلی) ماہنامہ

۳۔ چکبست کا ابتدائی کلام	اگست	۱۹۷۷ء
۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار "پیغام"	دسمبر	۱۹۸۴ء
۵۔ محمد علی تاج بھوپالی: شخص اور شاعر	اکتوبر	۱۹۸۶ء
۶۔ زلیخا کی کہانی: آزاد اور دوسروں کی زبانی	جون	۱۹۸۷ء
۷۔ نوعمر صحافی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد	مارچ	۱۹۸۸ء
۸۔ جاگتی راتوں کی فصل (تبصرہ)	از مرتضیٰ علی شاد مئی	۱۹۸۹ء
۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار قیدِ فرنگ میں	اگست	۱۹۸۹ء

۱۰۔ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں (تبصرہ) مالک رام فروری ۱۹۹۰ء

۱۱۔ کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں ستمبر ۱۹۹۵ء

آبشار (کلکتہ):

۱۲۔ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی آبشار، کلکتہ خاص نمبر ۱۹۹۱ء

۱۳۔ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات آبشار، کلکتہ، فیسٹول نمبر ۱۹۹۳ء

۱۴۔ آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کی رفتار آبشار، کلکتہ، خاص نمبر ۱۹۹۷ء

ادبی دنیا (لاہور) ماہنامہ:

۱۵۔ امیر مینائی بھوپال میں

ادبی مجلّہ شعبۂ اردو فارسی راجستھان یونیورسٹی، جے پور

۱۶۔ ذوق دہلوی ۱۹۸۲ء

اردو ادب علی گڑھ (دہلی)

۱۷۔ خمخانہ جاوید اور غالب نمبر ۱ ۱۹۶۹ء

۱۸۔ محمد عبداللہ: کلام غالب کا ایک ہم عصر شارح نمبر ۳ ۱۹۷۰ء

۱۹۔ محذوفات، اصلاحات، تبرکات حسرت موہانی نمبر ۱ ۱۹۷۳ء

۲۰۔ نور دیدہ (مولانا ابوالفضل محمد عباس رفعت شاگرد غالب کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف)

جنوری ۱۹۷۲ء

۲۱۔ احتشام حسین نظر نظر میں نمبر ۳، ۴ ۱۹۷۴ء

۲۲۔ اشاریہ یاس یگانہ چنگیزی نمبر ۱، ۲ ۱۹۸۲ء

سہ ماہی اردو (کراچی):

۲۳۔ ابوالفضل محمد عباس رفعت شیروانی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

اردو ایکشن (بھوپال) روزنامہ:

۲۴۔ اکیسویں صدی اور ہم اہل بھوپال یکم جنوری ۲۰۰۰ء

۲۵۔ ملا سجاد حسین کی یاد آتی ہے ۵/ اگست ۲۰۰۰ء

آفتاب جدید بھوپال (روزنامہ)

۲۶۔ مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق کے امکانات	۱۰؍دسمبر	۱۹۷۸ء
۲۷۔ کاروان سے آفتاب تک	۱۴؍ستمبر	۱۹۸۰ء
۲۸۔ میں سیفیہ کالج اور طلبا	یکم مارچ	۱۹۸۱ء
۲۹۔ اردو زبان و ادب، سیفیہ کالج اور بھوپال	۲۰؍ستمبر	۱۹۸۱ء
۳۰۔ جانے والے کی یاد آتی ہے	(یوم جمہوریہ ایڈیشن)	

اقبال ریویو (لاہور) سہ ماہی:

۳۱۔ ہندوستان میں اقبالیات	جولائی	۱۹۸۶ء

اقبال ریویو (حیدرآباد) سہ ماہی:

۳۲۔ اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری	اپریل۔تا اکتوبر ۱۹۸۰ء

اقبالیات لاہور:

۳۳۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد	جولائی ۱۹۸۹۔جنوری ۱۹۹۰ء

اکادمی لکھنؤ (دو ماہی)

۳۴۔ پرویز شاہدی کی غزل گوئی	جولائی	۱۹۸۳ء
۳۵۔ یادگار آزاد (اشاریہ) پہلی قسط	ستمبر۔اکتوبر	۱۹۸۸
۳۶۔ یادگار آزاد (اشاریہ) دوسری قسط	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء

آواز دہلی (پندرہ روزہ)

۳۷۔ اقبال کا پیام	۲۲؍دسمبر	۱۹۷۳ء

آہنگ (گیا) ماہنامہ:

۳۸۔ ایک اہم سوال	اپریل	۱۹۸۲ء

انتساب، سرونج (مدھیہ پردیش)

۳۹۔ قدم بہ قدم کا شاعر: انیس دہلوی	شمارہ ۳۶ ستمبر ۱۹۹۸ء

اوراق لاہور:

۴۰۔ آنکھوں دیکھی	اگست	۱۹۹۰ء

ایاز (بھوپال):

۴۱۔ بھوپال تاریخ ادب کے آئینے میں	عیدو دیوالی نمبر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۸ء

ایوانِ اردو (ماہنامہ) دہلی:

۴۲۔ کچھ حیات مولانا آزاد سے متعلق	دسمبر	۱۹۹۰ء
۴۳۔ مصاحبہ نگاری	نومبر	۱۹۹۱ء
۴۴۔ مولانا محمد حسین محوی	جون	۱۹۹۴ء

بیسویں صدی (ماہنامہ) دہلی:

۴۵۔ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے	اکتوبر	۱۹۹۰ء
۴۶۔ دردِ دل لکھوں کیوں کر	جون	۱۹۹۱ء

بلٹز (ہفتہ وار) بمبئی:

۴۷۔ ملا رموزی کا صد سالہ جشن	۲۷/اپریل	۱۹۹۶ء

پھلواری:

۴۸۔ ایک بچپن تین یادیں		۱۹۷۹ء

پرواز ادب (پٹیالہ) ماہنامہ:

۴۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد	جنوری	۱۹۸۰ء

تعمیر ہریانہ (ماہنامہ)

۵۰۔ اقبال اور پانی پت	مئی	۱۹۷۸ء

تحریر دہلی (سہ ماہی):

۵۱۔ انیس نما

جامعہ دہلی (ماہنامہ)

۵۲۔ اقبالیات	جولائی	۱۹۶۶ء
۵۳۔ راجندر سنگھ بیدی چودہ گھنٹے بھوپال میں		۱۹۶۷ء

جامعات ہند (دہلی)

۵۴۔ مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق کے امکانات

حریم (لکھنؤ)

۵۵۔ زلیخا بیگم — دسمبر ۱۹۹۱ء

دستک (کلکتہ)

۵۶۔ کیا اکبرالہٰ آبادی صرف طنز و مزاح نگار تھے — اپریل، مئی، جون ۱۹۹۴ء

دورِ حیات (بمبئی) ہفتہ وار

۵۷۔ اردو کا مستقبل ہندوستان میں

رضا لائبریری جرنل، رامپور

۵۸۔ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد — شمارہ ۱ — ۱۹۸۹ء

روحِ ادب (سہ ماہی) مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کلکتہ

۶۹۔ اعجاز صدیقی مرحوم — اپریل، جون ۱۹۸۸ء

زبان و ادب (سہ ماہی) بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ

۶۰۔ آں دہِ کوچک کہ مردم خیز بود (دسنہ) — جنوری، اپریل ۱۹۷۷ء

۶۱۔ اقبال اور علی گڑھ — جنوری، اپریل ۱۹۷۸ء

۶۲۔ تبصرہ نمودِ ہستی — جنوری، مارچ ۱۹۸۲ء

۶۳۔ اردو کے ذریعہ اسلام کی خدمت چودھویں صدی ہجری میں — اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۶ء

۶۴۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے نامور ہمعصر مولانا ابوالکلام آزاد — جولائی، اگست ۱۹۹۴ء

سب رس (ماہنامہ) حیدرآباد:

۶۵۔ نسخہ بھوپال ثانی سے متعلق تحریریں، خبریں، مراسلہ، مضامین — اکتوبر ۱۹۷۱ء

۶۶۔ ابوالکلام آزاد اور غالب کا ایک قصیدہ اور شاہ دلگیر — جنوری ۱۹۷۲ء

۶۷۔ اردو میں ببلیوگرافی — مئی ۱۹۷۳ء

۶۸۔ چند شخصیتیں، چند یادیں، چند باتیں — مارچ ۱۹۷۴ء

سوئنیر کل ہند اردو کانفرنس، انجمن ترقی اردو ہند، حیدرآباد:

۶۹۔ مدھیہ پردیش میں اردو تعلیم اور اس کے مسائل۔ — مارچ ۱۹۸۲ء

سہیل (گیا) ماہنامہ:

۷۰۔	یادوں کے سائے	شمارہ ۴۵، جلد ۵۴

شاعر (بمبئی) ماہنامہ:

۷۱۔	نمائش رسائل	مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء
۷۲۔	نجیب چچا	نومبر ۱۹۶۸ء
۷۳۔	مشاہیر ادب کے خطوط	دسمبر ۱۹۷۳ء
۷۴۔	مہدی کی خط نگاری	اکتوبر ۱۹۷۶ء
۷۵۔	جاں نثار اختر کی یاد میں	نومبر، دسمبر ۱۹۷۶ء
۷۶۔	مشورہ (انشائیہ)	جون، جولائی ۱۹۷۹ء
۷۷۔	اختر سعید خاں نظم اور غزل کے محترم شاعر	دسمبر ۱۹۸۴ء
۷۸۔	سید سلیمان ندوی: دسنہ اور اہلِ دسنہ	اپریل ۱۹۸۵ء
۷۹۔	ورودِ مسعود سے نذرِ مسعود تک	نمبر ۲ ۱۹۹۰ء

شگوفہ (ماہنامہ) حیدرآباد

۸۰۔	یارب نہ وہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	فروری ۱۹۷۹ء

صبح ادب (ماہنامہ) لکھنؤ

۸۱۔	مولانا آزاد کی خط نگاری	نومبر ۱۹۷۴ء
۸۲۔	عبدالرزاق کانپوری	اپریل، مئی ۱۹۷۶ء
۸۳۔	مولانا محوی صدیقی بچوں کے شاعر	نومبر ۱۹۷۶ء

صبح امید (ماہنامہ) بمبئی

۸۴۔	تاریخ ادب کے آئینے میں بھوپال	ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء

صبح نو (ماہنامہ) پٹنہ

۸۵۔	الاصلاح لائبریری (دسنہ)	۱۹۵۳ء
۸۶۔	ندوی صاحب مرحوم (پروفیسر نجیب اشرف ندوی) سالنامہ	جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

روز نامہ عوام، حیدر آباد

۸۷۔ اردو والوں کی ذمہ داری ۱۳راپریل ۱۹۹۷ء

غالب (کراچی) سہ ماہی

۸۸۔ خط نگاری

۸۹۔ غالب سے متعلق چند دریافتیں جولائی تا ستمبر ۱۹۷۵ء

۹۰۔ مطالعہ غبارِ خاطر جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء

غالب نامہ (دہلی) سہ ماہی

۹۱۔ غالب سے متعلق اشاریہ سازی جلد ۱، شمارہ ۱، ۲ ۱۹۷۶ء

غبارِ خاطر اورنگ آباد (ششماہی)

۹۲۔ غبارِ خاطر: ایک مطالعہ اکتوبر ۱۹۷۴ء

فروغِ ادب، بھونیشور

۹۳۔ چودھری محمد علی: ایک مکتوب نگار (مختصر جائزہ) جولائی تا دسمبر ۱۹۹۶ء

فروغِ اردو (ماہنامہ) لکھنؤ

۹۴۔ کتب خانہ الاصلاح، دسنہ اگست ۱۹۵۵ء

۹۵۔ حسرت کی سیاسی زندگی (کئی قسطوں میں) پہلی قسط دسمبر ۱۹۵۵ء

قومی راج (بمبئی) پندرہ روزہ

۹۶۔ ادیب اور سماجی ذمہ داریاں یکم اپریل ۱۹۷۷ء

۹۷۔ کرشن چندر جو ہم سے جدا نہیں ہوئے ۱۶راپریل ۱۹۷۷ء

قومی زبان (کراچی) پندرہ روزہ/ ماہنامہ

۹۸۔ حسرت کا سیاسی کردار یکم مارچ ۱۹۵۶ء

۹۹۔ اقبال بھوپال میں اپریل ۱۹۶۸ء

۱۰۰۔ حیات جاوید اور آزاد ۱۹۶۹ء

کاروانِ ادب، سینٹ زیویرس کالج بمبئی (سالانہ میگزین)

۱۰۱۔ نہ سنا جائے گا افسانہ ۱۹۵۱ء

۱۰۲۔ بھارت میں اردو کا مستقبل ۱۹۵۲ء

۱۰۳۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات ۱۹۵۳ء

۱۰۴۔ حذف واصلاح اقبال کے کلام میں ۱۹۵۴ء

۱۰۵۔ حسرت کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں ۱۹۵۵۔۵۶ء

۱۰۶۔ چند ترقی پسند شعراء ۱۹۵۶۔۵۷ء

کتاب لکھنؤ (ماہنامہ)

۱۰۷۔ خط نگاری جولائی ۱۹۷۵ء

کتاب نما (دہلی) ماہنامہ

۱۰۸۔ یوسف پاپا اپریل ۱۹۸۴ء

۱۰۹۔ بھوپال کا ایک افسانہ نگار (یادوں کے چراغ کی روشنی میں) اگست ۱۹۸۷ء

۱۱۰۔ غریب اردو اور ہمارا عجیب وغریب رویہ مئی ۱۹۸۹ء

۱۱۱۔ اردو، اردو والوں سے تعاون اور انصاف کی طالب اکتوبر ۱۹۸۹ء

۱۱۲۔ مسئلہ مادری زبان اردو کا مہمان اداریہ دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۱۳۔ ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت (تبصرہ) اکتوبر ۱۹۹۰ء

۱۱۴۔ اردو ہے جس کا نام فروری ۱۹۹۱ء

۱۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھوپال سے رشتہ مارچ ۱۹۹۱ء

۱۱۶۔ ظ۔ بھائی مئی ۱۹۹۱ء

۱۱۷۔ باتیں آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ستمبر ۱۹۹۱ء

۱۱۸۔ مرتضیٰ علی شاد بھوپال کی فضائے تغزل کا نمائندہ شاعر اگست ۱۹۹۳ء

۱۱۹۔ گر تو برا نہ مانے اگست ۱۹۹۴ء

۱۲۰۔ دیدہ وشنیدہ (ایک دیدہ ور کی خودنوشت) نومبر ۱۹۹۴ء

۱۲۱۔ جذبی صاحب اور تقریب اقبال اعزاز مئی ۱۹۹۵ء

۱۲۲۔ کس سے خالی ہوا جہاں آباد (مالک رام کے انتقال پر) اگست ۱۹۹۵ء

۱۲۳۔ سرسید تحریک اور آج کے تقاضے نومبر ۱۹۹۵ء

۱۲۴۔ ''اردو کے چند نامور ادیب اور مشہور شاعر'' پر ایک نظر | جون | ۱۹۹۶ء

۱۲۵۔ کتاب نما ۱۹۹۶ء کے اداریے اور قصہ اردو کی بے بسی کا | مئی | ۱۹۹۷ء

۱۲۶۔ جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ | مئی | ۱۹۹۸ء

۱۲۷۔ سرسید احمد خاں اور ان کا ایک عقیدت مند: اقبال | اکتوبر | ۲۰۰۰ء

کتابی دنیا (کراچی) ماہنامہ

۱۲۸۔ ابوظفر ندوی | اگست | ۱۹۵۸ء

مجلّہ سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال (سالنامہ)

۱۲۹۔ حالی کے شخصی مرثیے | جلد ۱، | ۶۴۔۱۹۶۲ء

۱۳۰۔ مہدی افادی | جلد ۲۔ ۳ | ۶۴۔۱۹۶۲ء

۱۳۱۔ جگر بھوپال میں | جلد ۴ | ۶۵۔۱۹۶۴ء

۱۳۲۔ علامہ اقبال بھوپال میں | جلد ۵ | ۶۷۔۱۹۶۶ء

مجلّہ علی گڑھ یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن بھوپال

۱۳۳۔ پاسبان سیفیہ ملا فخر الدین | ۱۹۹۵ء

۱۳۴۔ اقبال اور اشتراکیت | ۱۹۹۷ء

محراب (دہلی) سالنامہ

۱۳۵۔ علامہ اقبال کا بھوپال سے رشتہ | نومبر | ۱۹۷۱ء

معارف (اعظم گڑھ) ماہنامہ

۱۳۶۔ مقالات علامہ سید سلیمان ندوی | (کتابیات) مئی | ۱۹۶۶ء

معلم اردو (لکھنؤ) ماہنامہ

۱۳۷۔ آنکھوں دیکھی: بھاگلپور کی داستانِ غم | فروری | ۱۹۹۱ء

منصف (حیدر آباد) روزنامہ، سنڈے ایڈیشن

۱۳۸۔ ایک مراسلاتی مضمون شاخ گل کے تناظر میں بنام رفعت سروش | ۲۳ر مئی | ۱۹۹۳ء

مہر نیم روز (کراچی) روزنامہ

۱۳۹۔ اقبال کی تین نظمیں فلسفہ غم، فاطمہ بنت عبداللہ اور محاصرہ کے ابتدائی متن، مئی، اگست | ۱۹۵۸ء

۱۴۰۔ حیات سلیمان کی چند جھلکیاں (۱۹۴۴ء تک) اگست ۱۹۶۰ء

نخلستان (جے پور) ماہنامہ

۱۴۱۔ خواجہ حسن نظامی اور اقبال اکتوبر ۱۹۸۰، مارچ ۱۹۸۱ء

ندائے ملت، لکھنؤ

۱۴۲۔ بات اردو اور اردو رسم خط کی جلد ۵۲، شمارہ ۴۵۔۴۶، نومبر ۱۹۹۶ء

روزنامہ ندیم، بھوپال

۱۴۳۔ قصہ سیفیہ کالج کی تعمیر و ترقی کا ۵/ دسمبر ۱۹۹۴ء

۱۴۴۔ معمارِ اعظم ۲۷/ مارچ ۱۹۹۸ء

نقوش، لاہور

۱۴۵۔ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال دسمبر ۱۹۸۶ء

نوائے ادب، بمبئی (سہ ماہی)

۱۴۶۔ مقالہ نما چار شمارے جنوری تا دسمبر ۱۹۶۰ء

نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال

۱۴۷۔ نوراللہ صاحب مرحوم جنوری ۱۹۶۴ء

۱۴۸۔ پنڈت کیفی جنوری ۱۹۶۴ء

۱۴۹۔ مناجات بیوہ اپریل ۱۹۶۴ء

۱۵۰۔ میں اور بھوپال دسمبر ۱۹۶۴ء

۱۵۱۔ سرزمین بھوپال جلد ۳ نمبر ۱۔۲ ۱۹۶۵۔۱۹۶۶ء

۱۵۲۔ سر راس مسعود بھوپال میں جلد ۳ نمبر ۱۔۲ ۱۹۶۵۔۱۹۶۶ء

۱۵۳۔ امیر مینائی بھوپال میں جلد ۴ ۱۹۶۷۔۱۹۶۸ء

نیا دور لکھنؤ (ماہنامہ)

۱۵۴۔ افاداتِ مہدی اگست ۱۹۷۶ء

۱۵۵۔ علامہ اقبال کی انیسویں صدی کی نظمیں مئی ۱۹۷۷ء

۱۵۶۔ علامہ اقبال اور بمبئی جنوری ۱۹۷۸ء

۱۵۷۔	مولانا محوی صدیقی	مارچ	۱۹۸۱ء
۱۵۸۔	سید فضل الحسن حسرت موہانی (پہلی بار قیدِ فرنگ میں) یوم جمہوریہ نمبر، جنوری		۱۹۸۳ء
۱۵۹۔	مشفق خواجہ (ملاقات سے پہلے)	دسمبر	۱۹۸۶ء
۱۶۰۔	نسیم انہونوی میرے محترم میرے مکرم	جون	۱۹۸۹ء
۱۶۱۔	کچھ اپنی باتیں	نومبر	۱۹۹۲ء
۱۶۲۔	مولانا آزاد کا سیاسی سفر پہلی گرفتاری تک	اگست	۱۹۹۳ء

ہماری زبان، علی گڑھ و دہلی (ہفتہ وار)

۱۶۳۔	مولانا ابوظفر ندوی	۱۵ر جولائی	۱۹۵۸ء
۱۶۴۔	اقبال کی ایک نظم	یکم ستمبر	۱۹۵۸ء
۱۶۵۔	اقبال کی دو غزلیں	۱۵ر جنوری	۱۹۵۹ء
۱۶۶۔	اقبال کی چند غزلیں	۲۲ر اپریل	۱۹۵۹ء
۱۶۷۔	مولانا آزاد کے احسانات اردو ادب پر	۸ر جون	۱۹۵۹ء
۱۶۸۔	بنام اختر شیرانی	۲۲ر جولائی	۱۹۶۵ء
۱۶۹۔	صحافت پاکستان و ہند میں	۸ر ستمبر	۱۹۶۵ء
۱۷۰۔	بشیر الحق دسنوی مرحوم	۱۵ر اکتوبر	۱۹۶۵ء
۱۷۱۔	جگر مرادآبادی کا ایک سہرا	۱۸ر اپریل	۱۹۶۶ء
۱۷۲۔	محمد یوسف قیصر مرحوم	۸ر اگست	۱۹۶۸ء
۱۷۳۔	مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی (۱)	۱۵ر نومبر	۱۹۶۸ء
۱۷۴۔	حمد باری غالب کے ایک شاگرد عبدالسمیع رامپوری کی تصنیف	۸ر دسمبر	۱۹۶۸ء
۱۷۵۔	خمسہ بر غزل حضرت غالب	۱۵ر جنوری	۱۹۶۹ء
۱۷۶۔	مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی (۲)	یکم اگست	۱۹۶۹ء
۱۷۷۔	مولانا آزاد ابوالکلام آزاد اور خدنگ نظر	یکم نومبر	۱۹۶۹ء
۱۷۸۔	قادر نامہ	۸ر ستمبر	۱۹۷۰ء
۱۷۹۔	دیوانِ غالب بخط غالب	۲۲ر نومبر	۱۹۷۰ء

۱۸۰۔	مضامین آہ دہلوی	۲۲/دسمبر	۱۹۷۰ء
۱۸۱۔	تبرکات غالب واسد	۸/جنوری	۱۹۷۱ء
۱۸۲۔	قادرنامہ غالب	۸/مارچ	۱۹۷۱ء
۱۸۳۔	گلِ رعنا سے نسخۂ بھوپال ثانی تک	۲۲/مارچ	۱۹۷۱ء
۱۸۴۔	کچھ نسخۂ بھوپال ثانی سے متعلق	۱۵/ستمبر	۱۹۷۱ء
۱۸۵۔	مولانا آزاد، نواب صدیق حسن خاں اور غالب	یکم نومبر	۱۹۷۱ء
۱۸۶۔	مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن	۱۵/دسمبر	۱۹۷۱ء
۱۸۷۔	نسخۂ حمیدیہ یا نسخۂ بھوپال	۸/مارچ	۱۹۷۲ء
۱۸۸۔	دوانہ مر گیا آخر (ایم۔عرفان مرحوم)	۱۸/اپریل	۱۹۷۲ء
۱۷۹۔	ایک بھولی ہوئی قبر، قبر غالب	۸/مارچ	۱۹۷۳ء
۱۹۰۔	شاعر مشرق علامہ اقبال کا سنہ ولادت	۸/مئی	۱۹۷۳ء
۱۹۱۔	سلام مچھلی شہری	۱۵/اگست	۱۹۷۴ء
۱۹۲۔	ماہنامہ کتاب مرحوم	۸/اکتوبر	۱۹۷۵ء
۱۹۳۔	مولانا محوی صدیقی	یکم اپریل	۱۹۷۶ء
۱۹۴۔	علامہ اقبال انیسویں صدی عیسوی میں	۱۵/مئی	۱۹۷۷ء
۱۹۵۔	اقبال اور دار الاقبال بھوپال	۱۵/جولائی	۱۹۷۷ء
۱۹۶۔	بابائے اردو بنام محوی	یکم اگست	۱۹۷۹ء
۱۹۷۔	مدھیہ پردیش میں اردو	۱۵/اگست	۱۹۸۴ء
۱۹۸۔	سید سلیمان ندوی مرحوم (تصنیفات، تالیفات ترتیبات)	۸/مارچ	۱۹۸۵ء
۱۹۹۔	سلیمان نما	۸/مارچ	۱۹۸۵ء
۲۰۰۔	حالی وطن کا شیدائی (حالی نمبر)	۲۲/اپریل	۱۹۸۶ء
۲۰۱۔	کلام اقبال کی بازیافت	یکم ستمبر	۱۹۸۸ء
۲۰۲۔	اقبال اور لمعہ حیدرآبادی	۱۸/اپریل	۱۹۸۹ء
۲۰۳۔	شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے	یکم مئی	۱۹۸۹ء

۲۰۴۔	مکاتیب اقبال تبصرہ کے بارے میں	۸رفروری	۱۹۹۰ء
۲۰۵۔	علامہ سید سلیمان ندوی اور سفر پاکستان	۱۵رفروری	۱۹۹۰ء
۲۰۶۔	جشن صد سالہ ابوالکلام آزاد اور دہلی	۸رمارچ	۱۹۹۰ء
۲۰۷۔	مولانا ابوالکلام آزاد، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار	۱۵رمئی	۱۹۹۰ء
۲۰۸۔	جشن صد سالہ مولانا آزاد اور ایک کتاب	۸رستمبر	۱۹۹۰ء
۲۰۹۔	اردو کے ایک کرم فرما	۲۲راکتوبر	۱۹۹۰ء
۲۱۰۔	کچھ ابوالکلام آزاد نمبروں سے متعلق	۲۲ردسمبر	۱۹۹۰ء
۲۱۱۔	ظ۔ کی آزاد شناسی	۱۵رجون	۱۹۹۱ء
۲۱۲۔	ایک اہم اداریہ	یکم ستمبر	۱۹۹۱ء
۲۱۳۔	قصہ مولانا آزاد کے ۱۹۰۵ء میں سفر ممالک اسلامیہ کا	یکم اکتوبر	۱۹۹۱ء
۲۱۴۔	ایک فکر انگیز اداریہ	۲۲رجولائی	۱۹۹۲ء
۲۱۵۔	محمود الحسینی مرحوم بھوپال کے اردو صحافت کا ایک تابناک ستارہ	۱۵رفروری	۱۹۹۳ء
۲۱۶۔	ملا فخر الدین اردو کے ایک خاموش خدمت گزار کی وفات	۲۲راپریل	۱۹۹۳ء
۲۱۷۔	پروفیسر مرتضیٰ علی شاد نہیں رہے	۱۵رجولائی	۱۹۹۳ء
۲۱۸۔	انجمن کی خدمات پر تبصرہ	۲۲راکتوبر	۱۹۹۳ء
۲۱۹۔	قصہ پھر حکومت، اردو اور اردو والوں کا	یکم نومبر	۱۹۹۳ء
۲۲۰۔	بھوپال کی اردو صحافت کا ایک تابناک ستارہ محمود الحسینی	۱۵رنومبر	۱۹۹۳ء
۲۲۱۔	ڈاکٹر سلیم حامد رضوی: بھوپال کی تاریخ ادب اردو کے رام بابو سکسینہ	۸ردسمبر	۱۹۹۳ء
۲۲۲۔	کچھ آج کل (ماہنامہ) کے گوشہ مالک رام کے بارے میں	۱۵رمئی	۱۹۹۴ء
۲۲۳۔	بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے	۲۲راکتوبر	۱۹۹۴ء
۲۲۴۔	عرشی بھوپالی دو دہائی کا شاعر	۲۲رنومبر	۱۹۹۴ء
۲۲۵۔	۱۹۹۵ء کاش اردو کا سال ہو جائے	۲۲رجنوری	۱۹۹۵ء
۲۲۶۔	سہیل صدیقی مرحوم: غنچہ نا شگفتہ	۸رجولائی	۱۹۹۵ء
۲۲۷۔	بھوپال کا ایک گمنام عاشق اقبال: آصف شاہمیری	۲۲راگست	۱۹۹۵ء

۲۲۸۔	قصہ ایوان ملّا رموزی	۸ر ستمبر	۱۹۹۵ء
۲۲۹۔	ایوان ملّا رموزی کے بارے میں (ایک مراسلہ)	یکم اکتوبر	۱۹۹۵ء
۲۳۰۔	آج مولانا ابوالکلام آزاد بہت یاد آتے ہیں	۸ر دسمبر	۱۹۹۵ء
۲۳۱۔	ایوان ملّا رموزی اور صد سالہ جشن ولادت ملّا رموزی	۸ر اپریل	۱۹۹۶ء
۲۳۲۔	بھوپالیات کے جائزے	۱۵ر جون	۱۹۹۶ء
۲۳۳۔	قصہ اردو کی بے بسی کا	۲۲ر جون	۱۹۹۶ء
۲۳۴۔	بات اردو اور اردو رسم خط کی	۸ر اگست	۱۹۹۶ء
۲۳۵۔	فراق گورکھپوری اور اردو	۸، ۱۵ر دسمبر	۱۹۹۶ء
۲۳۶۔	خواجہ احمد فاروقی نمبر کے بارے میں (خط)	۲۲ر دسمبر	۱۹۹۶ء
۲۳۷۔	پروفیسر حامد جعفری مرحوم	۲۲ر جنوری	۱۹۹۷ء
۲۳۸۔	وزیر اعظم کی عدالت میں	۸ر مئی	۱۹۹۷ء
۲۳۹۔	کچھ آنند نرائن ملا صاحب کے بارے میں	یکم اگست	۱۹۹۷ء
۲۴۰۔	اردو اکیڈمیاں (مراسلہ)	یکم اگست	۱۹۹۷ء
۲۴۱۔	بات ایوان ملّا رموزی کی اور سچائیوں کی تلاش	۲۲ر اگست	۱۹۹۷ء
۲۴۲۔	انجمن ترقی اردو ہند کا نیا عزم	۸ر ستمبر	۱۹۹۷ء
۲۴۳۔	اردو کے ایک سچے خدمت گزار: ملا فخر الدین	۲۲ر ستمبر	۱۹۹۷ء
۲۴۴۔	سید شہاب الدین دسنوی (ماہر تعلیم، عاشقِ اردو، خادمِ قوم)	۸ر اگست	۱۹۹۸ء
۲۴۵۔	شہاب نامے بنام عبدالقوی دسنوی	۸ر اگست	۱۹۹۸ء
۲۴۶۔	میں اردو ہوں	۸ر فروری	۱۹۹۹ء
۲۴۷۔	کچھ اردو کے بارے میں	۱۵ر فروری	۱۹۹۹ء
۲۴۸۔	اردو اور نئی نسل (حقائق کی روشنی میں)	۲۲ر ستمبر	۱۹۹۹ء
۲۴۹۔	اکیسویں صدی کا استقبال	۸ر جنوری	۲۰۰۰ء
۲۵۰۔	محترم غزل گو: مجروح سلطانپوری، مجروح سلطانپوری نمبر، ۵ر جولائی تا ۷ر اگست		۲۰۰۰ء
۲۵۱۔	نئے سال ۲۰۰۱ء کی آمد اور ہم اہلِ ہند	یکم تا ۲۱ر جنوری	۲۰۰۱ء

۲۵۲۔ کالی داس گپتا رضا: معتبر شاعر، محترم محقق، انسان دوست، عاشق اردو، ۲۸؍جون ۲۰۰۱ء

۲۵۳۔ اردو محبت کی طلبگار ہے ۲۲؍تا۲۸؍مارچ ۲۰۰۲ء

۲۵۴۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی رخصت ہوئے ۲۲تا۲۸؍مئی ۲۰۰۲ء

۲۵۵۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور گجرات کے پس منظر میں ان کی ایک نظم، یکم تا ۷؍جولائی ۲۰۰۲ء

۲۵۶۔ اردو کتب و رسائل و اخبارات کی اشاعت اور معاشرہ کی ذمہ داریاں

۸؍تا۱۴؍اگست ۲۰۰۲ء

۲۵۷۔ ولی دکنی، ولی اورنگ آبادی، ولی گجراتی ۲۲؍جنوری ۲۰۰۳ء

۲۵۸۔ ارشد صدیقی بھی رخصت ہوئے یکم تا ۷؍مئی ۲۰۰۳ء

۲۵۹۔ انسان دوست شاعر: جگن ناتھ آزاد یکم تا ۷؍جون ۲۰۰۳ء

۲۶۰۔ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے پر ۲۲؍تا۲۸؍جولائی ۲۰۰۳ء
انجمن ترقی اردو کو مبارکباد

۲۶۱۔ اردو پر عجب وقت پڑا ہے ۸؍تا یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء

۲۶۲۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نمبر ایک مطالعہ ۸؍تا۱۴؍اپریل ۲۰۰۵ء

۲۶۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور شہر کلکتہ ۸؍تا۱۴؍فروری ۲۰۰۶ء

۲۶۴۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد: معتبر ادیب، محترم انسان یکم اکتوبر ۲۰۰۶ء

۲۶۵۔ اختر سعید خاں کی یاد میں (پہلی قسط) یکم تا ۷؍نومبر ۲۰۰۶ء

۲۶۶۔ اختر سعید خاں کی یاد میں (دوسری قسط) ۸؍تا۱۴؍نومبر ۲۰۰۶ء

ہندوستان (روزنامہ) بمبئی

۲۶۷۔ بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے ۲۸؍اکتوبر ۱۹۹۴ء

روزنامہ ہند سماچار

۲۶۸۔ اردو شعرا کی انوکھی مجلس ۱۴؍اگست ۲۰۰۰ء

۲۶۹۔ اختر نظمی ایک سادہ شخص ایک منفرد غزل گو، سہ ماہی تمثیل، بھوپال، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء

۲۷۰۔ میرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے سہ ماہی جہانِ اردو، دربھنگہ
جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء

۲۷۱۔ ارشد صدیقی کا ابتدائی شعری سفر، پندرہ روزہ صدائے اردو، بھوپال، ۱۵؍ نومبر ۲۰۰۲ء

۲۷۲۔ اتحاد پیدا کریں، یہ گھڑی محشر کی ہے، صحت مند انداز سے غور کریں (ایک طویل خط بنام نعیم کوثر)

پندرہ روزہ صدائے اردو، بھوپال، یکم دسمبر ۲۰۰۲ء

۲۷۳۔ میں تنہا شاعر سہ ماہی کاروانِ ادب، بھوپال، جلد ۲، شمارہ ۵، ۸، ۹

۲۷۴۔ علقمہ شبلی کی ابتدائی غزلیں سہ ماہی مژگاں، کولکاتہ جنوری تا جون ۲۰۰۲ء

۲۷۵۔ حالی کا سیاسی شعور سہ ماہی گلبن، لکھنؤ جنوری، اپریل ۲۰۰۳ء

۲۷۶۔ ارشد صدیقی کا ابتدائی شعری سفر سہ ماہی رنگ، دھنباد

شمارہ ۲۲، جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۳ء

۲۷۷۔ میں کیوں لکھتا ہوں سہ ماہی ''روزن'' شمارہ ۲، بھدرک، اپریل تا جون ۲۰۰۳ء

۲۷۸۔ پندرہ اگست اور ہماری ذمہ داریاں، پندرہ روزہ صدائے اردو، بھوپال

یکم ستمبر ۲۰۰۳ء

۲۷۹۔ جگن ناتھ آزاد: ایک ہمہ جہت شخصیت، ماہنامہ ایوانِ اردو، دہلی، مارچ ۲۰۰۵ء

۲۸۰۔ جگن آزاد آزاد: ایک ہمہ جہت شخصیت

سہ ماہی تمثیل، بھوپال، جلد ۵، شمارہ ۱۹۔ ۲۰، اپریل تا ستمبر ۲۰۰۵ء

۲۸۱۔ اختر سعید خاں کی یاد میں سہ ماہی تمثیل، بھوپال، اکتوبر ۲۰۰۶، مارچ ۲۰۰۷ء

۲۸۲۔ للہ الحمد از ڈاکٹر شاداب ذکی (حمدیہ کلام کا مجموعہ)، ماہنامہ ''لاریب'' لکھنؤ، جون ۲۰۰۷ء

۲۸۳۔ رفعت سروش ادب کی رفعتوں کے متلاشی، سہ ماہی انتساب، سرونج، شمارہ ۶۴

تبصرے

۱۔ اقبال ریویو سہ ماہی حیدر آباد آج کل دہلی (ماہنامہ) ستمبر ۱۹۷۹ء

۲۔ اقبال، نذرل اور ٹیگور آج کل، دہلی (ماہنامہ) ستمبر ۱۹۷۹ء

۳۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، آج کل دہلی (ماہنامہ) نومبر ۱۹۷۹ء

۴۔ جائزہ مخطوطات اردو: مشفق خواجہ شناخت، بھوپال نمبر ۱، جلد ۱ ۱۹۷۹ء

۵۔ اقبال ریویو، سہ ماہی حیدر آباد شناخت بھوپال نمبر ۲، جلد ا ۱۹۸۰ء

۶۔ معاصرین: مولانا عبدالماجد دریا آبادی شاعر، بمبئی جلد ۵۱، نمبر ۷ ۱۹۸۰ء

۷۔ وضاحتی کتابیات کتاب نما، دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء
(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ڈاکٹر مظفر حنفی)

۸۔ نمودِ ہستی: ڈاکٹر محمد حسنین زبان و ادب، پٹنہ جنوری، مارچ ۱۹۸۲ء

۹۔ انیس شناسی: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کتاب نما، دہلی مارچ ۱۹۸۳ء

۱۰۔ اردو نظم معریٰ اور آزاد نظم ڈاکٹر حنیف کیفی، کتاب نما، دہلی، مارچ ۱۹۸۳ء

۱۱۔ اردو افسانہ روایت: اور مسائل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جائزہ مرتبہ مظفر حنفی، خالد محمود

۱۲۔ جائزہ مرتبہ مظفر حنفی، خالد محمود کتاب نما، دہلی

۱۳۔ تلامذۂ غالب مالک رام، کتاب نما، دہلی اپریل ۱۹۸۶ء

۱۴۔ گفتارِ غالب مالک رام، کتاب نما، دہلی اگست ۱۹۸۶ء

۱۵۔ تحفۃ السرور شمس الرحمٰن فاروقی، کتاب نما، دہلی، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۶۔ میر تقی میر نمبر (نقوش لاہور) مرتبہ محمد طفیل، جائزہ مرتبہ، مظفر حنفی۔ خالد محمود

۱۷۔ جاگتی راتوں کی فصیل مرتضیٰ علی شاد، آج کل، دہلی مئی ۱۹۸۹ء

۱۸۔ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں آج کل، دہلی فروری ۱۹۹۰ء

۱۹۔ شاخِ گل رفعت سروش، کتاب نما، دہلی اگست ۱۹۹۳ء

۲۰۔ چند تصویرِ بتاں صابر دت، شب خون، الہ آباد، اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۳ء

۲۱۔ روحِ غزل ڈاکٹر مظفر حنفی، دستک سہ ماہی ہوڑا، جنوری، مارچ ۱۹۹۴ء

۲۲۔ مولانا آزاد کا قیام رانچی جمشید قمر، زبان و ادب، پٹنہ ستمبر، دسمبر ۱۹۹۴ء

۲۳۔ دوسرے دن کا سورج اندر موہن کیف، کتاب نما، دہلی، اپریل ۱۹۹۹ء

۲۴۔ محمد حسین آزاد مظفر حنفی، اثبات و نفی، کلکتہ، جلد ۲، شمارہ ۷، ۱۹۹۹ء

۲۵۔ دوسرے دن کا سورج اندر موہن کیف، کتاب نما، دہلی، اپریل ۱۹۹۹ء

سووینیر

۱۔ یومِ کیفی: پنڈت کیفی (مضمون) بزم فنکار، بمبئی ۱۵۔۱۶؍دسمبر ۱۹۵۶ء

۲۔ یومِ غالب: مرزا غالب (مضمون) بزم فنکار، بمبئی ۱۸؍مارچ ۱۹۵۷ء

غالبیات

مطبوعات

۱۔ بھوپال اور غالب	شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۹ء
۲۔ غالبیات (ببلوگرافی)	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۳۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۰ء
۴۔ قادر نامہ غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۱ء
۵۔ مطالعہ خطوطِ غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۶ء
۶۔ مطالعہ خطوطِ غالب (اضافہ کے ساتھ)	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۹
۷۔ مطالعہ خطوطِ غالب (طبع ثانی)	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۷ء

خاص نمبروں اور عام شماروں میں

۱۔ غالب نما (اشاریہ)	غالب نمبر ۲، اردوئے معلی، دہلی یونیورسٹی	۱۹۶۱ء
۲۔ خم خانہ جاوید اور غالب	غالب نمبر، اردو ادب علی گڑھ	۱۹۶۹ء
۳۔ مولانا عباس رفعت (شاگرد غالب)	غالب نمبر، جامعہ، دہلی	۱۹۶۹ء
۴۔ یار محمد خاں شوکت (شاگرد غالب)	غالب نمبر، شاعر، بمبئی	۱۹۶۹ء
۵۔ غالب کے خلاف ایک کتاب کا تعارف، غالب نمبر، نقوش، لاہور		۱۹۶۹ء
۶۔ ابوالفضل محمد عباس شیروانی	غالب نمبر، اردو کراچی	۱۹۶۹ء
۷۔ غالب کا ایک شاگرد یار محمد خاں شوکت، غالب نمبر، ادب لطیف، لاہور		۱۹۶۹ء
۸۔ غالب اور اپریل فول	غالب نمبر، نئی قدریں، حیدرآباد، پاکستان	۱۹۶۹ء
۹۔ انشائے نور چشم	غالب نمبر، آج کل، دہلی	۱۹۶۹ء

۱۰۔ ہاشمی اور نسخہ حمیدیہ	غالب نمبر، سب رس، حیدر آباد	۱۹۶۹ء
۱۱۔ نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی	غالب نمبر، مجلّہ سیفیہ، بھوپال	۷۰-۱۹۶۹ء
۱۲۔ بیاضِ غالب نسخہ بھوپال ثانی	غالب نمبر ۳، نقوش، لاہور	۱۹۷۱ء
۱۳۔ قادر نامہ	غالب نمبر ۳، نقوش، لاہور	۱۹۷۱ء
۱۴۔ غالب اور حسن و عشق	اثبات و نفی، کلکتہ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء

۱۵۔ مداح غالب عبدالرحمٰن بجنوری اور ناقدین کا رویہ، تنقیدات (انتخاب مقالات غالب نامہ)
مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۷ء

اقبالیات

مطبوعات

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۷ء
۲۔ ہندوستان میں اقبالیات	اقبال اردو اکادمی، لاہور	۱۹۷۶ء
۳۔ اقبال انیسویں صدی میں	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۴۔ اقبال اور دلّی	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۵۔ بچوں کا اقبال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۶۔ اقبال اور دار الاقبال بھوپال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۷۔ اقبالیات کی تلاش	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۸۔ اقبالیات کی تلاش	گلوب پبلشرز، اردو بازار، لاہور	۱۹۸۵ء

مضامین خاص نمبروں اور مجموعوں میں

۱۔ حیاتِ اقبال	اقبال نمبر ۱، نقوش، لاہور	ستمبر	۱۹۷۷ء
۲۔ بچوں کا اقبال	اقبال نمبر ۲، نقوش، لاہور	دسمبر	۱۹۷۷ء
۳۔ اقبال کا بھوپال سے تعلق	اقبال نمبر ۲، نقوش، لاہور	دسمبر	۱۹۷۷ء
۴۔ ہندوستان میں اقبالیات	اقبال نمبر، اردو ادب، دہلی		۱۹۷۹ء
۵۔ اقبال: کچھ مضامین	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	دسمبر	۱۹۷۹ء

۶۔ کچھ اقبال اور دارالاقبال بھوپال کے بارے میں، یادگار اقبال، مجلہ سیفیہ بھوپال ۱۹۸۰ء

۶۔ اقبال کی اردو غزل گوئی (۱۹۰۵ تک) رموزِ اقبال، ظفر اوگانوی، کلکتہ ۱۹۸۴ء

۷۔ اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اکبری اقبال نمبر، شگوفہ، حیدر آباد ۱۹۸۶ء

۸۔ اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اقبال کے شعری اسالیب، ڈاکٹر عبدالحق ۱۹۸۹ء

مضامین عام شماروں میں

۱۔ حذف و اصلاح اقبال کے کلام	کاروانِ ادب، بمبئی		۱۹۵۴ء
۲۔ اقبال کی تین نظمیں	مہر نیم روز، کراچی	مئی اگست	۱۹۵۸ء
۳۔ اقبال کی ایک نظم	ہماری زبان، علی گڑھ	یکم ستمبر	۱۹۵۸ء
۴۔ اقبال کی دو غزلیں	ہماری زبان، علی گڑھ	۵/جنوری	۱۹۵۹ء
۵۔ اقبال کی چند غزلیں	ہماری زبان، علی گڑھ	۲۲/اپریل	۱۹۵۹ء
۶۔ اقبالیات	جامعہ، دہلی	جولائی	۱۹۶۶ء
۷۔ علامہ اقبال بھوپال میں	مجلۂ سیفیہ، بھوپال		۱۹۶۷-۱۹۶۶ء
۸۔ علامہ اقبال کا بھوپال سے رشتہ	محراب، دہلی	نومبر	۱۹۷۱ء
۹۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کا سنہ ولادت	ہماری زبان، علی گڑھ	۸/مئی	۱۹۷۳ء
۱۰۔ اقبال کا پیام	آواز، دہلی	۲۲/نومبر	۱۹۷۳ء
۱۱۔ ہندوستان میں اقبالیات	اقبال ریویو، لاہور		۱۹۷۶ء
۱۲۔ علامہ اقبال کی انیسویں صدی کی نظمیں	نیا دور، لکھنؤ	مئی	۱۹۷۷ء
۱۳۔ علامہ اقبال انیسویں صدی میں	ہماری زبان، دہلی	۸/مئی	۱۹۷۷ء
۱۴۔ علامہ اقبال اور بمبئی	نیا دور، لکھنؤ	جنوری	۱۹۷۸ء
۱۵۔ اقبال اور علی گڑھ	زبان و ادب، پٹنہ	اپریل	۱۹۷۸ء
۱۶۔ اقبال اور پانی پت	تعمیر، ہریانہ	مئی	۱۹۷۸ء
۱۷۔ اقبال اور دارالاقبال بھوپال	ہماری زبان، دہلی	۵/جولائی	۱۹۷۸ء
۱۸۔ خواجہ حسن نظامی اور اقبال	نخلستان، جے پور	اکتوبر، مارچ ۱۹۸۱	۱۹۸۰ء
۱۹۔ کلامِ اقبال کی بازیافت	ہماری زبان، دہلی	یکم ستمبر	۱۹۸۸ء
۲۰۔ اقبال اور لمعہ حیدر آبادی	ہماری زبان، دہلی	۸/اپریل	۱۹۸۹ء

۲۱۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد اقبالیات لاہور، پاکستان جولائی ۸۹، جنوری ۱۹۹۰ء

۲۲۔ بھوپال کا ایک گمنام عاشقِ اقبال: آصف شاہمیری

ہماری زبان، دہلی ۲۲ راگست ۱۹۹۵ء

۲۳۔ سرسید احمد خاں اور ان کا ایک عقیدتمند اقبال (۱) سیمینار علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال، نومبر ۱۹۹۸ء

(۲) کتاب نما دہلی اکتوبر ۲۰۰۰ء

(۳) علی گڑھ نمبر سہ ماہی فکر و آگہی، دہلی ۲۰۰۰ء

ابوالکلامیات

مطبوعات

۱۔ مضامین لسان الصدق	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۲۔ مطالعہ غبار خاطر	نئی آواز، دہلی	۱۹۸۱ء
۳۔ ابوالکلام آزاد	ساہتیہ اکادمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۴۔ ابوالکلام محی الدین احمد آزاد	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۸ء
۵۔ ماہنامہ لسان الصدق، کلکتہ	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۸۸ء
۶۔ یادگار آزاد	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۸ء

۷۔ ہفتہ وار پیغام، کلکتہ (تقدیم ثانی عبدالقوی دسنوی)، خدابخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۸۹ء

۸۔ تلاشِ آزاد	(مہاراشٹر اردو اکیڈمی، بمبئی کے مالی تعاون سے)	۱۹۹۰ء
۹۔ معاصرین و متعلقاتِ آزاد	نئی آواز، دہلی	۱۹۹۶ء

رسائل کے خاص نمبر

۱۔ لسان الصدق آزاد نمبر، اردو ادب علی گڑھ ۱۹۵۹ء

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار پیغام صحافت نمبر ۲، آج کل، دہلی دسمبر ۱۹۸۴ء

۳۔ آزادی صحافت میں ۱۹۰۸ء تک مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ایوانِ اردو، دہلی ۱۹۸۸ء

رسائل واخبارات میں

آج کل ماہنامہ دہلی

۱۔ زلیخا بیگم کی کہانی آزاداور دوسروں کی زبانی	جون ۱۹۸۷ء
۲۔ نوعمر صحافی ابوالکلام آزاد محی الدین احمد آزاد	مارچ ۱۹۸۸ء
۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار قیدِ فرنگ میں	اگست ۱۹۸۹ء
۴۔ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، از مالک رام (تبصرہ)	فروری ۱۹۹۰ء

پروازِ ادب، پٹیالہ:

مولانا ابوالکلام آزاد	جنوری ۱۹۸۰ء

سب رس، حیدر آباد

مولانا ابوالکلام آزاد، غالب کا ایک قصیدہ اور شاہ دلگیر	جنوری ۱۹۷۲ء

صبح ادب، لکھنؤ

مولانا آزاد کی خط نگاری	نومبر ۱۹۸۴ء

غالب، کراچی

مطالعہ غبارِ خاطر	جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء

غبارِ خاطر اورنگ آباد

غبارِ خاطر: ایک مطالعہ	اکتوبر ۱۹۷۴ء

ہماری زبان علی گڑھ، دہلی

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے احسانات اردو ادب پر	۸ ر جون ۱۹۵۹ء
۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور خدنگ نظر	یکم نومبر ۱۹۵۹ء
۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد نواب صدیق حسن خاں اور غالب	یکم نومبر ۱۹۷۱ء
۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن	۱۵ ر دسمبر ۱۹۷۱ء
۵۔ جشن صد سالہ ابوالکلام آزاد اور دہلی	۸ ر مارچ ۱۹۹۰ء
۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار	۱۵ ر مئی ۱۹۹۰ء
۷۔ جشن صد سالہ مولانا آزاد اور ایک کتاب	۸ ر دسمبر ۱۹۹۰ء

۸۔ ابوالکلام آزاد نمبروں سے متعلق ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۰ء

۹۔ قصہ مولانا آزاد کے ۱۹۰۵ء میں سفر ممالک اسلامیہ کا یکم اکتوبر ۱۹۹۱ء

۱۰۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد بہت یاد آتے ہیں ۸ر دسمبر ۱۹۹۵ء

اقبالیات لاہور

اقبال اور ابوالکلام آزاد جولائی ۱۹۸۹ء۔جنوری ۱۹۹۰ء

کتاب نما، دہلی

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت اکتوبر ۱۹۹۰ء

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھوپال سے رشتہ مارچ ۱۹۹۱ء

۳۔ قصہ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی کا ستمبر ۱۹۹۱ء

ایوانِ اردو، دہلی (ماہنامہ)

کچھ حیات ابوالکلام آزاد سے متعلق دسمبر ۱۹۹۰ء

نیا دور لکھنو (ماہنامہ)

مولانا آزاد کا سیاسی سفر پہلی گرفتاری تک اگست ۱۹۹۳ء

زبان وادب پٹنہ (سہ ماہی)

۱۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے نامور ہمعصر مولانا ابوالکلام آزاد جولائی تا اگست ۱۹۹۴ء

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام رانچی، جمشید قمر (تبصرہ) ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء

اکادمی (دو ماہی) لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک نامور ہمعصر سید سلیمان ندوی جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء

بھوپالیات

مطبوعات

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۷ء
۲۔ بھوپال اور غالب	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۶۹ء
۳۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی	شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۰ء
۴۔ ایک شہر پانچ مشاہیر	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۵۔ نذرِ سجاد	سیفیہ کالج بھوپال	۱۹۷۴ء
۶۔ نذرِ تخلص	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۷۔ اقبال اور دارالاقبال بھوپال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۸۔ ارمغانِ سیفیہ (بہ اشتراک ڈاکٹر محمد نعمان)	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۹۔ اجنبی شہر	تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۹۲ء
۱۰۔ فخر نامہ (بہ اشتراک ڈاکٹر محمد نعمان)	سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۹۷ء
۱۱۔ بمبئی سے بھوپال تک	(ناشر: مصنف)	۲۰۰۴ء

مضامین (خاص نمبروں میں)

۱۔ محوی صدیقی	عبدالحق نمبر	زبان، کراچی	۱۹۶۷ء
۲۔ محمد عباس رفعت	غالب نمبر	جامعہ، دہلی	۱۹۶۹ء
۳۔ یار محمد خاں شوکت	غالب نمبر	شاعر، بمبئی	۱۹۶۹ء
۴۔ غالب کے خلاف ایک کتاب کا تعارف، غالب نمبر ا، نقوش، لاہور			۱۹۶۹ء
۵۔ ابوالفضل محمد عباس رفعت شیروانی، غالب نمبر		اردو، کراچی	۱۹۶۹ء
۶۔ غالب کا ایک شاگرد یار محمد شوکت، غالب نمبر		ادب لطیف لاہور	۱۹۶۹ء
۷۔ غالب اور اپریل فول	غالب نمبر	نئی قدریں، حیدرآباد، پاکستان	۱۹۶۹ء
۸۔ غالب اور بھوپال	غالب نمبر	نیا دور، لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۹۔ انشائے نورِ چشم	غالب نمبر	آج کل، دہلی	۱۹۶۹ء

۱۰۔ ہاشمی اور نسخہ حمیدیہ	غالب نمبر	سب رس، حیدر آباد	۱۹۶۹ء
۱۱۔ نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی	غالب نمبر	مجلّہ سیفیہ، بھوپال	۷۰۔۱۹۶۹ء
۱۲۔ بیاضِ غالب نسخہ بھوپال ثانی	غالب نمبر ۳	نقوش، لاہور	۱۹۷۱ء
۱۳۔ جاں نثار اختر کی غزل	جاں نثار اختر نمبر	فن اور شخصیت، لاہور	۱۹۷۶ء
۱۴۔ اقبال کا بھوپال سے تعلق	اقبال نمبر ۲	نقوش، لاہور	۱۹۷۷ء

۱۵۔ کچھ اقبال، دار الاقبال اور سیفیہ کالج بھوپال کے بارے میں

	یادگارِ اقبال	مجلّہ سیفیہ، بھوپال	۱۹۸۰ء
۱۶۔ مولانا محوی صدیقی	علامہ محوی صدیقی نمبر، اسباق، پونا		۱۹۸۳ء
۱۷۔ بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی، نصف صدی نمبر، نیا دور، لکھنؤ، مارچ۔ مئی			۱۹۹۵ء

مضامین، کتابوں میں

۱۔ دادا	نذر سجاد	سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۴ء
۲۔ محسن اعظم	نذر سجاد	سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۷۴ء
۳۔ مولانا محوی صدیقی بچوں کے شاعر		معیار ادب بکڈپو، بھوپال	۱۹۷۶ء
۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال، مطالعہ سلیمان، دار العلوم تاج المساجد، بھوپال			۱۹۸۶ء
۵۔ جانے والے کی یاد آتی ہے	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۶۔ تم سلامت رہو	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۷۔ اردو زبان سیفیہ کالج اور بھوپال، ارمغانِ سیفیہ		شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء

۸۔ ایک یادگار سپاس نامہ (فیض کی سیفیہ کالج میں آمد پر)

	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۹۔ سیفیہ کالج عزیز طلبا اور میں	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۱۰۔ استقبالیہ	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۱۱۔ قیامت صغریٰ (دو خط)	ارمغانِ سیفیہ	شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال	۱۹۸۶ء
۱۲۔ مداح غالب عبد الرحمٰن بجنوری "تنقیدات"، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد			۱۹۹۷ء

تعارف، پیش لفظ، تاثرات، خطوط

۱۔ بازگشت (تعارفی خاکہ) نئی نسل کی نئی غزل از متین سید ۱۹۷۳ء

۲۔ پیش لفظ ہفت رنگ از شاہد میر ۱۹۸۱ء

۳۔ پیش لفظ مطالعات از نسیم شہنوی ۱۹۸۱ء

۴۔ تعارف سمندر آشنا از خالد محمود ۱۹۸۲ء

۵۔ تعارف نقد بجنوری از ڈاکٹر حدیقہ بیگم ۱۹۸۳ء

۶۔ پیش لفظ ڈاکٹر مظفر حنفی از ڈاکٹر محبوب راہی ۱۹۸۶ء

۷۔ پیش لفظ رقصِ نوا از نصرت صدیقی ۱۹۸۸ء

۸۔ بات نثار راہی کی پت جھڑ کی آواز از نثار راہی ۱۹۹۳ء

۹۔ وفا کی باتیں نقشِ وفا از وفا صدیقی ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۰۔ پیش لفظ دیار یار کی باتیں از لطف اللہ خاں نظمی ۱۹۹۴ء

۱۱۔ کوثر صدیقی کی بچوں کی شاعری، پھول ایک ہی چمن کے، از کوثر صدیقی ۱۹۹۵ء

۱۲۔ بات خالد عابدی کی اردو مراسلاتی انٹرویو، از خالد عابدی ۱۹۹۶ء

۱۳۔ کچھ کوثر صدیقی کی شاعری کے بارے میں، فصیلِ شب، از کوثر صدیقی ۱۹۹۷ء

۱۴۔ محمد مسعود علی خاں اختر وادیِ شاعری میں، آئینۂ فکر، از مسعود علی خاں اختر ۱۹۹۸ء

۱۵۔ بات نثار راہی کے افسانوں کی، رائفل از نثار راہی ۱۹۹۸ء

۱۶۔ سروش کی شاعری پر ایک نظر اجالوں کی رہگزر از سریش پرشاد سروش ۱۹۹۸ء

رسائل واخبارات میں مضامین

۱۔ نور اللہ صاحب مرحوم نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال جنوری ۱۹۶۴ء

۲۔ میں اور بھوپال نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال دسمبر ۱۹۶۴ء

۳۔ جگر بھوپال میں مجلہ سیفیہ، سیفیہ کالج بھوپال جلد ۴ ۶۵۔۱۹۶۴ء

۴۔ سرزمین بھوپال نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال دسمبر ۱۹۶۴ء

۵۔ سراس مسعود بھوپال میں، نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال، جلد ۳، نمبر ۱۔۲، ۶۶۔۱۹۶۵

۶۔ جگر مرادآبادی کا ایک سہرا ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۱۸/اپریل ۱۹۶۶ء

۷۔ علامہ اقبال بھوپال میں — مجلہ سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال، جلد ۵ — ۶۷-۱۹۶۶ء

۸۔ راجندر سنگھ بیدی ساڑھے چودہ گھنٹے بھوپال میں — جامعہ دہلی، ماہنامہ — ۱۹۶۷ء

۹۔ امیر مینائی بھوپال میں — نوائے سیفیہ، سیفیہ کالج، بھوپال، جلد ۴ — ۶۸-۱۹۶۷ء

۱۰۔ مولانا محوی صدیقی بچوں کے شاعر، صبح ادب، لکھنؤ — نومبر — ۱۹۶۷ء

۱۱۔ اقبال بھوپال میں — قومی زبان (پندرہ روزہ) کراچی — اپریل — ۱۹۶۸ء

۱۲۔ محمد یوسف قیصر مرحوم — ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۸/اگست — ۱۹۶۸ء

۱۳۔ دیوانِ غالب بخط غالب — ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۲۲/نومبر — ۱۹۷۰ء

۱۴۔ گلِ رعنا سے نسخہ بھوپال ثانی تک، ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۲۲/مارچ — ۱۹۷۱ء

۱۵۔ کچھ نسخہ بھوپال ثانی سے متعلق، ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۱۵/ستمبر — ۱۹۷۱ء

۱۶۔ نسخہ بھوپال ثانی سے متعلق تحریریں، سب رس ماہنامہ، حیدر آباد — اکتوبر — ۱۹۷۱ء

۱۷۔ مولانا آزاد، نواب صدیق حسن خاں اور غالب
ہماری زبان، ہفتہ، دہلی — یکم نومبر — ۱۹۷۱ء

۱۸۔ علامہ اقبال کا بھوپال سے رشتہ، محراب، دہلی ماہنامہ — نومبر — ۱۹۷۱ء

۱۹۔ نوردیدہ (مولانا ابوالفضل محمد عباس رفعت شاگرد غالب کی غیر مطبوعہ تصنیف)
اردو ادب، علی گڑھ — جنوری — ۱۹۷۲ء

۲۰۔ نسخہ حمیدیہ اور نسخہ بھوپال — ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۸/مارچ — ۱۹۷۲ء

۲۱۔ دوانہ مر گیا آخر (ایم عرفان مرحوم)، ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — ۸/اپریل — ۱۹۷۲ء

۲۲۔ چند شخصیتیں چند یادیں چند باتیں، سب رس، ماہنامہ، حیدر آباد — مارچ — ۱۹۷۴ء

۲۳۔ تاریخ ادب اردو کے آئینہ میں بھوپال، صبح امید، ماہنامہ، بمبئی — ستمبر اکتوبر — ۱۹۷۵ء

۲۴۔ مولانا محوی صدیقی — ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی — یکم اپریل — ۱۹۷۶ء

۲۵۔ عبدالرزاق کانپوری — صبح ادب، لکھنؤ — اپریل، مئی — ۱۹۷۶ء

۲۶۔ محمد علی تاج بھوپالی شخص اور شاعری، آج کل، دہلی — اکتوبر — ۱۹۷۶ء

۲۷۔ امیر مینائی بھوپال میں — ادبی دنیا، لاہور

۲۸۔ جاں نثار اختر کی یاد میں — شاعر، ماہنامہ، بمبئی — دسمبر — ۱۹۷۶ء

۲۹۔ اقبال اور دار الاقبال بھوپال　ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　۱۵/ جولائی　۱۹۷۷ء

۳۰۔ بابائے اردو بنام محوی　ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　یکم اگست　۱۹۷۹ء

۳۱۔ میں سیفیہ کالج اور طلبا　آفتاب جدید، بھوپال، روزنامہ　یکم مارچ　۱۹۸۰ء

۳۲۔ کارواں سے آفتاب تک　آفتاب جدید، بھوپال روزنامہ　۱۴/ ستمبر　۱۹۸۰ء

۳۳۔ مولانا محوی صدیقی　نیا دور، لکھنؤ، ماہنامہ　مارچ　۱۹۸۱ء

۳۴۔ اردو زبان و ادب، سیفیہ کالج اور بھوپال، آفتاب جدید بھوپال، روزنامہ، ۲۰/ ستمبر ۱۹۸۱ء

۳۵۔ مدھیہ پردیش میں اردو تعلیم اور اس کے مسائل

سوینیر کل ہند کانفرنس انجمن ترقی اردو ہند، حیدر آباد　مارچ　۱۹۸۲ء

۳۶۔ کچھ اپنی باتیں　نیا دور، لکھنؤ، ماہنامہ　نومبر　۱۹۸۲ء

۳۷۔ مدھیہ پردیش میں اردو　ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　۱۵/ اگست　۱۹۸۴ء

۳۸۔ اختر سعید خاں نظم اور غزل کے محترم شاعر، شاعر ماہنامہ، بمبئی　دسمبر　۱۹۸۴ء

۳۹۔ بھوپال کا ایک افسانہ نگار (یادوں کے چراغ کی روشنی میں)

کتاب نما، دہلی (ماہنامہ)　اگست　۱۹۸۷ء

۴۰۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا بھوپال سے رشتہ، کتاب نما، دہلی، ماہنامہ　مارچ　۱۹۹۱ء

۴۱۔ ملا فخر الدین اردو کے ایک خاموش خدمت گزار کی وفات

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　۲۲/ اپریل　۱۹۹۳ء

۴۲۔ پروفیسر مرتضیٰ علیم شاد نہیں رہے، ہماری زبان ہفتہ وار، دہلی　۱۵/ جولائی　۱۹۹۳ء

۴۳۔ مرتضیٰ علی شاد — بھوپال کی فضائے شعری کا نمائندہ شاعر

کتاب نما (ماہنامہ) دہلی　اگست　۱۹۹۳ء

۴۴۔ بھوپال کی اردو صحافت کا ایک تابناک ستارہ — محمود الحسینی

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　۱۵/ نومبر　۱۹۹۳ء

۴۵۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی — بھوپال کی تاریخ اردو ادب کے رام بابو سکسینہ

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی　۸/ دسمبر　۱۹۹۳ء

۴۶۔ مولانا محمد حسین محوی ایک تعارف، ایوانِ اردو، ماہنامہ، دہلی　جون　۱۹۹۴ء

۴۷۔ عرشی بھوپالی دودہائی کا شاعر ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۲۲؍نومبر ۱۹۹۴ء

۴۸۔ قصہ سیفیہ کالج کی تعمیر و ترقی کا، روزنامہ ندیم، بھوپال ۵؍دسمبر ۱۹۹۴ء

۴۹۔ جذبی صاحب اور تقریب اقبال اعزاز، کتاب نما، دہلی مئی ۱۹۹۵ء

۵۰۔ سہیل صدیقی مرحوم غنچہ ناشگفتہ، ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۸؍جولائی ۱۹۹۵ء

۵۱۔ بھوپال کا ایک گمنام عاشق اقبال: آصف شاہمیری

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۲۲؍اگست ۱۹۹۵ء

۵۲۔ قصہ ایوان ملا رموزی ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۸؍ستمبر ۱۹۹۵ء

۵۳۔ ایوان ملا رموزی کے بارے میں ایک مراسلہ، ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء

۵۴۔ پاسبان سیفیہ ملا فخر الدین مجلہ یوم سرسید، بھوپال ۱۹۹۵ء

۵۵۔ ایوان ملا رموزی اور صد سالہ جشن ولادت ملا رموزی

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۸؍اپریل ۱۹۹۶ء

۵۶۔ ملا رموزی کا صد سالہ جشن بلٹز ہفتہ وار، بمبئی ۲۷؍اپریل ۱۹۹۶ء

۵۷۔ پروفیسر حامد جعفری مرحوم ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۲۲؍جنوری ۱۹۹۷ء

۵۸۔ بات ایوان ملا رموزی کی اور سچائیوں کی تلاش

ہماری زبان، ہفتہ وار، دہلی ۲۲؍اگست ۱۹۹۷ء

۵۹۔ مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق کے امکانات، جامعات ہند، دہلی نمبر ۵

۶۰۔ ملا سجاد حسین مرحوم عظیم محسن روزنامہ اردو ایکشن، بھوپال ۱۵؍اگست ۲۰۰۰ء

۶۱۔ اردو شعراء کی انوکھی مجلس روزنامہ ہند سماچار، جالندھر ۱۴؍اگست ۲۰۰۰ء

☆☆
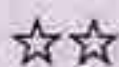
مطبوعات پر تبصرے اور تاثرات

ایک اور مشرقی کتب خانہ (۱۹۵۴ء) پہلی کتاب

(۱)

"صوبہ بہار کے ایک گوشہ میں دیسنہ کا مردم خیز خطہ غیر معروف نہیں ہے۔ عبدالقوی دسنوی صاحب نے حال ہی میں ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دیسنہ میں الاصلاح لائبریری کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ جس میں اردو فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ علاوہ ان نوادر کے اس کتب خانہ میں اردو کے قدیم رسالوں اور اخباروں کے ایسے فائل موجود ہیں جو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اس ادارے میں قدیم رسائل و جرائد کے محفوظ کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتابچہ میں مخطوطات اور قدیم رسائل و جرائد کی ایک مختصر فہرست دی گئی ہے جو اردو زبان کے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اچھی رہنما ثابت ہوگی"۔

(ہماری زبان، ۱۵ر جون ۱۹۵۴ء)

(۲)

"علامہ سید ندوی مرحوم کے وطن قصبہ دیسنہ ضلع پٹنہ میں طلبا کا قائم کردہ کتب خانہ الاصلاح کے شاید ہند کے دیہاتی و قصباتی کتب خانوں میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کتب خانہ نے ۱۹۵۴ء میں اپنی طلائی جوبلی منائی ہے اور اس تقریب پر یہ رسالہ شائع ہوا ہے۔ جس میں کتب خانہ کی تاریخ اور اس کے ذخیرہ کی تفصیل کے ساتھ قصبہ دیسنہ کے ارباب کمال موجودہ حال کے مختصر حالات درج ہیں۔ رسالہ کے شروع میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ایک خط کا عکس اور اس کتب خانہ کے بارے میں صدر جمہوریہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد کے معائنہ کی رپورٹ بھی شامل ہے''۔

(صدیق جدید لکھنؤ، ۲۷ راگست ۱۹۵۴ء)

(۳)

'' دیسنہ ضلع پٹنہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا مولد و منشاء ہے۔ یہاں پر ایک عظیم الشان کتب خانہ قدیم زمانے سے قائم ہے جس میں اردو مخطوطات اور عربی و فارسی مخطوطات اور اخبارات و رسائل بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اور یہ کتب خانہ اس نوعیت سے ہندوستان کے مشہور کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں اس عظیم الشان کتب خانہ کی کتابوں اور مخطوطات کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے اور ساتھ ہی دیسنہ کی مختصر تاریخ، دیسنہ کے اہل علم و ارباب کمال اور کتب خانہ الاصلاح دیسنہ کے تحت بہترین علمی اور تاریخی مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ پھر اردو مخطوطات اور فارسی و عربی مخطوطات اور اخبارات و رسائل کی فہرست بیان کی گئی ہے اور ہر نسخہ کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے''۔

(ماہنامہ 'البلاغ' بمبئی، تعلیم نمبر، دسمبر ۱۹۵۴ء جنوری۔ فروری ۱۹۵۵ء)

(۴)

'' حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کا وطن دیسنہ ضلع پٹنہ مسلمان شرفاء کی قدیم اور مردم خیز بستی ہے۔ یہاں ہر زمانے میں اصحابِ علم و کمال پیدا ہوتے رہے۔ آج بھی اس گاؤں میں تعلیم کا جتنا چرچا ہے وہ کسی شہر میں بھی مشکل سے ملے گا۔ اس لیے یہاں ہر دور میں علم و فن کا مذاق رہا اور آج سے نصف صدی سے اوپر یہاں اردو کا ایک کتب خانہ قائم ہے۔ جو ہندوستان میں اپنی خصوصیت میں منفرد ہے، اردو کی مطبوعہ کتابوں کی اتنی بڑی تعداد مشکل سے کسی دوسرے کتب خانہ میں مل سکتی ہے اس کی تقریباً کل مطبوعہ کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں، اس لیے شائقین دور دور سے اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس کی ترقی کا سہرا کتب خانے کے پرانے اور کہن سال ناظم مولوی سید عبدالحکیم صاحب کے سر ہے جنھوں نے اپنی پوری عمر اس کتب خانہ کے لیے وقف کردی تھی، اس گولڈن جبلی کی یادگار ہیں۔ دیسنہ کے ایک ہونہار نوجوان عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس کتب خانہ

اور ویسنہ کی مختصر تاریخ قلم بند کی۔ اس میں یہاں کے ہر زمانہ کے اصحابِ علم وکمال کا بھی تذکرہ ہے اور آخر میں اردو کے مخطوطات کا کسی قدر تفصیلی اور عربی، فارسی مخطوطات اور اردو کی فورٹ ولیم کالج وغیرہ کے قدیم مطبوعات کا اجمالی ذکر اور پرانے اخبارات و رسائل کے فائل کی فہرست ہے۔ کتاب کے شروع میں کتب خانہ کے متعلق ان مشاہیر کی رائیں نقل کردی گئی ہیں جنھوں نے اس کتب خانہ کو دیکھا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے''۔

(معارف، اعظم گڑھ، نمبر ۴، جلد ۷۳)

حسرت کی سیاسی زندگی (چند جھلکیاں)

(۱۹۵۶ء)

(۱)

''اس کتاب میں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ جن کو حسرت کے واقعاتی شعروں نے اور زیادہ دلچسپ بلکہ تابناک بنادیا ہے۔ حسرت موہانی کے اس قسم کے شعروں سے:

ہدایت کا زمانہ تھا اہل سوویت نے
دکھائی سب کو راہ حریت بے خوف دیں ہوکر

پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی شدید مذہبیت کے باوجود اشتراکیت سے کس قدر متاثر تھے۔ اس تضاد میں بظاہر تطابق کی کوئی صورت ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ انگریز کی دشمنی نے کمیونزم کو ان کی نگاہ میں پسندیدہ بنادیا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کو بھی کمیونزم سے خاص لگاؤ ہے اس لیے ان اشعار کو چن چن کر کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ جن میں حسرت مرحوم نے اشتراکیت کی مدح سرائی کی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔

(ماہنامہ فاران، کراچی، اپریل ۱۹۵۶ء)

(۲)

''مولانا حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر اردو میں اب بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ عبدالقوی صاحب دسنوی کا یہ مقالہ جو بہ اقساط رسالہ فروغِ اردو، لکھنؤ میں نکلا ہے اس کمی کو ایک حد تک پورا کررہا ہے۔ حسرت کی نثری تالیف مشاہدات زنداں جو ان کے پہلے دور اسیری سے متعلق ہے اور ان کے کلام کے سیاسی اشعار سے مرتب نے خاص مدد لی ہے لیکن ساتھ ہی بعض عاشقانہ رنگ کے اشعار کو بھی کھینچ تان کر سیاسی اشعار کے زمرہ میں لے آیا گیا ہے۔ مثلاً:

کھل گیا ہے ترے جمال سے رنگ
تری ملبوس ارغوانی کا

بہرحال اس کتاب سے ان کی سیاسی زندگی، ان کی قربانیوں اور ان کی استقامت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

صفحہ ۱۱ پر رسالہ اردوئے معلیٰ کے جس خاص نمبر کا ذکر ہے اس میں غلطی سے مصطفیٰ کامل کے بجائے مصطفیٰ کمال لکھ دیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مصطفیٰ کامل پاشا مصری، مصر کی سیاست میں مخالف برطانیہ کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ انھیں کے متعلق ایک جوشیلا مضمون اردوئے معلیٰ میں نکلا تھا اور اس پر حسرت صاحب پہلی بار جیل بھیجے گئے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا (ترکی) کا تو اس وقت کہیں وجود بھی نہ تھا"۔

(ہفتہ وار صدق جدید، لکھنؤ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

(۳)

"ایک مختصر رسالہ ہے جناب عبدالقوی دسنوی کا جس میں انھوں نے حسرت کی سیاسی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں صرف تین ہستیاں ایسی پیدا ہوئیں جنھوں نے سیاست و ادب دونوں میں بیک وقت خاص امتیاز حاصل کیا، مولانا محمد علی، مولانا حسرت اور مولانا آزاد، لیکن مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کا سیاسی رجحان ان کی ادبیت پر غالب آ گیا اور حسرت پر ادبی رجحان ان کی سیاست پر۔ یہاں تک کہ آج لوگ حسرت کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کی سیاسی قربانیوں سے کم واقف ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ حسرت کے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا جاتا اور اس ضرورت کو عبدالقوی دسنوی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ پورا کیا"۔

(ماہنامہ "نگار" اپریل ۱۹۵۶ء)

(۴)

"حسرت موہانی شاعر ہونے کے علاوہ بہت اونچے درجہ کے سیاسی لیڈر بھی تھے، لیکن ان کی سیاست پر بہت سے دور آئے اور گزر گئے اور اس راہ میں کبھی ان کو کسی ایک مقام پر ٹھہرنا نصیب نہیں ہوا۔ عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس مقالہ میں مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس مقالہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حسرت کی شاعری اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے بالکل بے جوڑ اور بے تعلق نہیں تھے زبان

صاف اور شگفتہ ہے"۔

(ماہنامہ 'برہان' دہلی، مارچ ۱۹۵۶ء)

(۵)

"عملی سیاست اور شاعری دونوں باتیں عام طور سے ایک شخصیت میں بہت کم جمع ہوتی ہیں کیوں کہ دونوں کے محرکات واحساسات ایک دوسرے کے ضد نہیں تو بڑی حد تک بے میل ضرور ہیں۔ جس شخص میں شعر وسیاست جمع ہو جائیں وہ فکر ونظر اور کردار وعمل کے اعتبار سے اپنے ماحول میں ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا۔

مولانا حسرت موہانی مرحوم ہمارے ملک میں اس ممتاز شخصیت کے مالک تھے وہ زندگی کے روزِ اول سے مرتے دم تک اسی ممتاز شخصیت کے مالک رہے۔

جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس کتاب میں مولانا حسرت مرحوم کو اسی ممتاز شخصیت میں پیش کیا ہے اور بڑی سلیقہ مندی سے حسرت مرحوم کے شعر وسیاست میں ہم آہنگی دکھائی ہے۔

لوگ حسرت کو غزل گو شاعر سمجھتے ہیں، مگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزل گوئی کا محور ان کی عروسِ سیاست ہے اور ان کے اشعار ان کی سیاسی زندگی کے ترجمان اور آئینہ دار ہیں۔

دسنوی صاحب نے "حسرت کی سیاسی زندگی" میں مرحوم کے سیاسی افکار ورجحانات پر ان کے اشعار ہی سے استدلال نہیں کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں حسرت مرحوم کی تحریروں اور ان سے متعلق واقعات کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

اسلوب بیان نہایت ستھرا، طرزِ استدلال بہت نتیجہ خیز اور رنگ نگارش بڑا ہی دلکش ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ اس موضوع پر آئندہ مستقل تصنیف پیش فرمائیں گے"۔

(روزنامہ 'انقلاب' بمبئی ۱۶/ مارچ ۱۹۵۶ء)

مجلّہ سیفیہ (جلد اول)

(۱۹۶۱۔۱۹۶۲ء)

(۱)

(ہفتہ وار ''ہماری زبان'' (۸؍جولائی ۱۹۶۲ء) علی گڑھ

''سیفیہ کالج بھوپال کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں، صرف چھ سال ہے۔ اس مختصر عرصے میں کالج نے جو ترقی کی ہے اس کی روشن مثال مجلۂ سیفیہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

مجلہ سیفیہ میں غزلوں اور افسانوں سے زیادہ تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، سائنسی اور عام معلوماتی مضامین ہیں جن کی مجموعی تعداد سولہ ہے اور یہ شگون نیک ہے کہ ان میں سے ایک تہائی سے زیادہ مضامین طالب علموں کے لکھے ہیں اور یہ خاص محنت سے لکھے گئے ہیں۔ نظم اور افسانوں کا حصہ تقریباً تمام کا تمام طالب علموں نے پُر کیا ہے۔ اور یہ حصہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اساتذہ کے مقالات میں عبدالقوی دسنوی کا ''حالی کے شخصی مرثیے'' اور ڈاکٹر گیان چند کا ''آغازِ نطق سے اردو تک'' دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے۔

سیفیہ کالج کے طلبا قابلِ مبارک باد ہیں جنھوں نے اردو رسائل کی برادری میں ایک قابلِ قدر رسالے کا اضافہ کیا ہے۔ کتابت کی پاکیزگی، طباعت کی صفائی اور سرورق کی سادگی طلبا اور ان کے رہنما اساتذہ کی خوش مذاقی کی آئینہ دار ہے۔

(۲)

(''دورِ حیات'' بمبئی۔ ۲۶؍اگست ۱۹۶۲ء)

''مجلّہ سیفیہ، سیفیہ ڈگری کالج کا ترجمان ہے اس کی اشاعت کی تمام تر ذمہ داری طلبا پر ہے اور انھوں نے اسے ترتیب بھی دیا ہے۔

اس پرچہ میں بجز چار چھ تخلیقات کے تقریباً ساری کاوشیں طلبا کے قلم کی مرہونِ منت ہیں اس لیے ان میں ابھی وہ Perfection نہیں آیا جو بالغ النظر اور مکمل شعور کا

پتہ دے سکے۔

نگاہ اولین میں اس رسالے کی اشاعت کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔ اردو ادب کی نئی پود میں اب تک کوئی ایسی آواز نہیں سنائی دی جو غالب، اقبال، حالی، شبلی، حسرت، جگر اور پریم چند کی آواز سے ملتی جلتی نہ ہو تو کم از کم اس کا عکس ہی ہو۔

لکھنے پڑھنے کا شوق طلبا ہی میں زیادہ ہوتا ہے اور اسی طبقہ سے اچھے ادیب اور شاعر ابھرتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو اگر اجاگر ہونے کا موقع نہ ملے تو وہ گھٹ کر رہ جاتی ہیں، لہٰذا اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملے اور یہ کام کالجوں کے رسالے بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ اگر یہ رسالے ایک طرف طلبا کے ذوق کو آسودگی بخشتے ہیں تو دوسری طرف اس سے ان کی ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے اور ادبی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے وہ خود کو ہر چیز سے لیس پاتے ہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدرسہ اور کالج رسالوں کی اشاعت کی طرف توجہ دیں۔

زیر نظر شمارے میں ''آغازِ نطق سے اردو تک''، ''انیس کی مرثیہ نگاری''، ''حالی کے شخصی مرثیے'' خاصہ کی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے گو مضمون میں اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ مفید اور دلچسپ ہے۔

''ایک خط'' بھی سائنسی معلومات پر اچھا مضمون ہے لیکن اس میں جا بجا انگریزی کی ترکیبیں آجانے سے روانی میں فرق آگیا ہے۔

شعری حصہ میں ''فردوس یقین'' نام کی کہنگی کے باوجود اچھی نظم ہے۔ افسانوں کا حصہ یونہی سا ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بغیر کسی مشق و مطالعہ کے افسانہ نگاری شروع کر دیتے ہیں اور ان کے افسانے رسائل میں جگہ نہیں پاتے تو وہ دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے لیے قدرتی صلاحیت ہونے سے قطع نظر بے انتہا مطالعہ کی ضرورت ہے اگر آپ افسانہ لکھنا چاہتے ہوں تو اس کے لیے کم از کم پچاس افسانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں آپ ایک اچھے افسانہ نگار بن سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر رسالہ اچھا ہے جس کے لیے سیفیہ ڈگری کالج کے طلباء قابلِ مبارکباد ہیں۔ (ق۔م۔ح)

مجلّہ سیفیہ جلد پنجم

(۱۹۶۶ء_۶۷)

(۱)

'ہماری زبان' یکم اگست ۱۹۶۷ء

جناب عبدالقوی دسنوی کے زیرِ نگرانی اور سید ساجد زیدی کی ادارت میں نکلنے والا سیفیہ کالج بھوپال کا یہ مجلّہ حسنِ ادارت اور حسنِ انتخاب کا اچھا نمونہ ہے۔ اس شمارے میں مضامین محنت سے لکھوائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ابوسحر، ڈاکٹر سید حامد حسین، سید حیدر عباس رضوی اور آفاق حسین صدیقی کے مضامین طلباء کی نصابی ضروریات کے لیے مفید ہیں۔ میگزین کا ایک حصہ عربی ادب کے مضامین پر مشتمل ہے۔ عبدالقوی دسنوی کا مقالہ "علامہ اقبال بھوپال میں" جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس میگزین کی زینت ہے۔ خلافت عباسیہ میں علم ریاضی کا عروج بہت دلچسپ مضمون۔ اردو زبان میں اس قسم کے مضامین کی ضرورت ہے بشرطیکہ ان مضامین کو سہل اور آسان زبان میں ادا کیا جائے۔ اقبال مسعود کا مضمون 'آزادی کا پہلا نقیب پیامِ آزادی' اس لحاظ سے اہم ہے کہ ابھی تک صحافت کی جو تاریخیں منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں اس اخبار کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے مزید تصریح کی ضرورت ہے۔ حوالے کچھ اور دے دیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ کالج کے منیجر فخرالدین صاحب سے انٹرویو بھی دلچسپ ہے اور خاص طور سے اس کا وہ حصہ جس میں مسلم یونیورسٹی کا تذکرہ ہے۔

اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے رسائل کو وہاں کے طلبا ہی کے ذہن اور شغف کا ترجمان ہونا چاہیے کہ ان کی جولانیوں اور تگ و دو کا پہلا میدان ان کا اپنا ہی رسالہ ہوتا ہے اور یہ کہ اس قسم کے رسالوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ طلباء کی خفتہ صلاحیتوں اور ان کی اختراعی قوتوں کو منظرِ عام پر لائے۔ زیرِ نظر شمارہ میں طلبا کے کچھ اور مضامین ہوتے تو بہتر تھا۔ مجموعی طور پر رسالہ سرورق سے لے کر آخر تک خوش مذاقی اور نفاست پسندی کا ثبوت ہے اور بہت سے کالجوں کی میگزینوں کے لیے نشانِ راہ بھی۔ (اصغر عباس)

(۲)

ماہنامہ فروغِ اردو، لکھنؤ ستمبر ۱۹۶۷ء

سیفیہ کالج بھوپال ملک وملت کے تعلیمی اداروں میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ ادھر کئی سال سے اس کا اردو میگزین سالانہ نمبر بڑے آب وتاب سے شائع ہوتا ہے۔ سالِ رواں یعنی ۶۷۔۱۹۶۶ء کا نمبر جس کی ضخامت ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں مضامین کی کمیت وکیفیت دونوں کے لحاظ سے سابق سالناموں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

مضامین کا بڑا حصہ علمی، ادبی ومعلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔ جس میں صرف اردو ہی پر نہیں بلکہ انگریزی اور عربی ادب پر بھی بڑے پُرمعلومات مضامین شامل ہیں۔ اس قابلِ قدر سالنامہ کی اشاعت پر اس کے نگراں جناب عبدالقوی دسنوی ایم اے اور سید ساجد ندوی مدیر رسالہ دونوں مستحقِ مبارکباد ہیں۔

سالنامہ کا بہترین اور اپنے موضوع سے اچھوتا مضمون ''علامہ اقبال بھوپال میں'' کے عنوان سے عبدالقوی دسنوی صاحب کے قلم سے ہے جو اقبالیات کے اردو لٹریچر میں ایک خوشگوار وقابلِ مطالعہ اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبیر کی مرثیہ نگاری پر ڈاکٹر ابومحمد سحر کا مضمون مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ اور خوب جچا تلا ہے۔ مولانا آزاد کے ادبی شاہکار مجموعہ مکاتیب غبارِ خاطر پر آفاق حسین صدیقی کا مختصر مضمون اور ذکی الرحمٰن صاحب کا مضمون 'انگریزی ادب میں مضمون نگاری' کی ابتدا اور عزیز انصاری کا مضمون میر تقی میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' راجندر سنگھ بیدی کا مقالہ ''افسانہ: قدیم'' ہر اعتبار سے معیاری کہے جانے کے مستحق ہیں۔

سالنامہ کی جان وہ پانچ مقالات ہیں جو عربی ادب پر صفحہ ۱۰۵ سے شروع ہوکر ۱۸۴ تک چلے گئے ہیں۔ عربی ادب پر اتنی تازہ ترین اور محققانہ معلومات اردو میں شاید پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان میں مولوی حبیب ریحان ندوی اور مولوی عبدالحلیم ندوی کے مضامین ''جدید عربی شاعری کا بانی محمود سامی البارودی'' اور ''بیسویں صدی میں عربی ادب کی نشوونما وترقی'' خاص طور سے قابلِ دید ومستحق داد ہیں۔

نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی اچھا خاصہ ہے۔ رسالہ میں علامہ اقبال کی تصویر اور

کالج سے تعلق رکھنے والے متعدد گروپ فوٹو بھی شامل ہیں۔ کاغذ وطباعت کے اعتبار سے بھی معیار خاصہ اونچا ہے''۔

(حکیم عبدالقوی دریابادی)

(۳)

ماہنامہ 'شب خون' الہ آباد، دسمبر ۱۹۶۷ء

''مجلّہ سیفیہ'' اردو کے مشہور استاد عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں نکلتا ہے۔ اس کی نفاست اور حسن دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ ایک کالج کی میگزین ہے اگرچہ مشمولات کی سطح بہت بلند نہیں ہے لیکن کچھ باہری ادیبوں کی دلچسپ تقاریر، ایک دو اچھے مضامین اور خاص کر ''اقبال بھوپال میں'' کے ماخذ اصل اور عصری ہیں۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کے قیامِ بھوپال اور دربارِ بھوپال سے ان کے تعلق اور ان کے گھریلو کردار پر بڑی دلچسپ اور کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ''اقبال بھوپال میں'' ایک کتابچہ کی حیثیت سے بھی شائع کردیا گیا ہے۔ کتابچہ اور مجلّہ دونوں بہت خوبصورت لکھے اور چھاپے گئے ہیں''۔

(شمس الرحمٰن فاروقی)

☆☆

مجلّہ سیفیہ (غالب نمبر) جلد ششم (۷۰-۱۹۶۹ء)

(۱)

ہفتہ وار 'ہماری زبان'، علی گڑھ

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ بڑی لگن کے ساتھ علمی مقاصد کے حصول کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ غالب صدی کے موقع پر انھوں نے جو کتابیں شائع کی ہیں وہ عموماً علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی ہیں۔

شعبہ نے مجلّہ کا غالب نمبر بھی شائع کیا ہے۔ اس میں رضا محمد حضرت جی کے تعارف کے ساتھ غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کے علاوہ دیوانِ غالب کے دونوں بھوپالی نسخوں کا جس طور پر تعارف کرایا گیا ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔

مجلّہ سیفیہ کے اس غالب نمبر کے مرتبین نے عہد حاضر کے نام برآوردہ اساتذہ کے مضامین کے ساتھ ساتھ کالج کے اساتذہ اور طلبا کے رشحاتِ قلم بھی شائع کیے ہیں۔ طلبا کے مضامین سے شعبہ کے تعلیمی معیار اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان میں بیشتر بہت اچھے ہیں۔ ایک بات جو ان مضامین کو پڑھنے کے (بعد) ذہن میں آئی یہ ہے کہ طلباء کو اپنے ماخذ پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔ غیر معیاری اور سرسری قسم کے مضامین کا حوالہ دینے سے خود ان کے مضامین کا معیار پست ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال طلبا کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے بعض اچھوتے لیکن اہم تر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے مثلاً عمر حیات خاں غوری نے غالب کے قصائد پر، متین سید نے تلمیحات غالب پر، خالد محمود نے غالب کی نعت گوئی پر اور سید ظہور الاسلام نے غالب کی خود اپنے کلام کی شرح پر، یہ سب مضامین دلچسپ بھی ہیں اور قابلِ مطالعہ بھی۔ میگزین کا حصہ نظم بھی اچھا ہے۔ نثار راہی نے ''غالب سیفیہ کالج میں'' خوب لکھا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

سیفیہ کالج بھوپال میں شاید دو تین سال ہوئے ایم اے کے درجات کا قیام عمل میں

آیا ہے۔ اس منزل پر اس قدر کامیاب غالب نمبر کی اشاعت سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ انشاء اللہ یہ شعبہ زبان و ادب کی خدمت میں جلد امتیاز حاصل کر سکے گا۔

(محمد انصار اللہ)

(۲)

ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی، ستمبر ۱۹۷۰ء

سیفیہ کالج، نہ صرف بھوپال بلکہ پورے مدھیہ پردیش میں اس وقت اعلیٰ تعلیم اور وسیع پیمانے پر اردو کے تحفظ ترویج اور ترقی کا ایک معیاری اور مثالی ادارہ ہے۔ یہاں کے لائق اساتذہ، ہونہار طلبا اور اردو نواز سرپرستوں کی مساعیِ جمیل کا ایک نمایاں ثبوت مجلّہ سیفیہ غالب نمبر بھی ہے۔

غالب صدی کے موقع پر ملک کے تمام ثقافتی، تہذیبی اور تعلیمی مراکز اور اداروں کی جانب سے اپنے اپنے طریقوں پر اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی خاصے اہتمام اور ایک باضابطہ پروگرام کے تحت اس سلسلہ کی تقریبوں کا آغاز ہوا۔ تقریری مقابلے، بزم مقالات اور مختلف قسم کی ادبی نشستوں کا انتظام کیا گیا۔ جن میں طلبا اور مقامی ادیبوں اور مقرروں نے حصہ لیا۔ باہر سے بھی ممتاز شعرا، اہلِ قلم اور غالب شناس حضرات مدعو کیے گئے۔ انھیں سب کے افکار و خیالات کا ایک خوبصورت مرقع اور کارآمد مجموعہ ''مجلّہ سیفیہ غالب نمبر'' ہے۔

پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر گیان چند جین، وجاہت علی سندیلوی، عابد رضا بیدار، عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر سید حامد حسین، سید حیدر عباس رضوی نے غالب کی شاعری، اس کے رموز و محاسن کے فن اور شخصیت کے بہت سے روشن اور قابلِ لحاظ پہلوؤں کا بڑی واقف کاری، عالمانہ تحقیق اور جائز توصیف و تنقید کے ساتھ احاطہ کر لیا ہے۔ حنیف کیفی صاحب نے غالب کی سیرت اور کردار کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اب تک ہم سنتے آئے تھے کہ 'خطائے بزرگاں گرفتن خطا است' لیکن نفسیاتی تجزیے کے عمل و دخل میں سب مباح ہے اور نثر کے اکیس مضامین میں سے تقریباً نصف ایسے ہیں جن کو باذوق طالب علموں بلکہ مستقبل کے قلم کاروں کی خوشگوار اور خوش آئند کوششوں سے

تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جناب عبدالقوی دسنوی صاحب صدر شعبہ اردو، ان کے رفقائے کار اور طلبا مبارکباد اور تحسین و توصیف کے مستحق ہیں کہ ان لوگوں کی باہمی کوششوں سے ایک ایسا رسالہ اشاعت پذیر ہوا جو غالب صدی کے شایانِ شان اور سیفیہ کالج کے پُر خلوص کارکنوں کے ادبی شغف کا ترجمان ہے۔

(ولی شاہجہاں پوری)

(۳)

ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد، نومبر ۱۹۷۰ء

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا نام محتاجِ تعارف نہیں رہا ہے۔ آپ نے اقبال اور غالب کے بھوپال سے تعلق پر کئی مضامین پیش کیے ہیں اور کتابیں بھی منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ یہ رسالہ پروفیسر صاحب موصوف ہی کی نگرانی میں طلبائے سیفیہ کالج کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر محمد مجیب کے مضمون ''غالب کی شاعری'' سے رسالہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر گیان چند کا ''غالب کا صحیفہ منسوخ'' ہے اس میں غیر متداول کلام کا ایسا انتخاب کیا گیا ہے جس کو غالب نے حذف کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی دیوان منسوخ کی شرح لکھی ہے۔ غالب نے انتخاب کی کلہاڑی بعض شاخہائے گل پر بھی چلا دی، انھیں میں سے چند شاخ ہائے گل کی توضیح و تشریح ملتی ہے۔ تیسرا مضمون شاہ غمگین کے نام غیر مطبوعہ مکتوبات پر رضا محمد حضرت جی کا ہے۔ میر سید علی شاہ عرف حضرت جی ملقب بہ خدا نما گوالیار کے صوفی باصفا تھے اور غالب سے ان کے مراسم رہے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کا نہایت احترام سے ذکر کیا ہے۔ یہ خطوط فارسی میں ہیں جنھیں حضرت موصوف کے خلیفہ ہدایت النبی نے نقل کر کے ۱۲۵۷ھ میں اس کو کتابی شکل دے دی ہے اور جو کتب خانہ شاہ غمگین اکادمی گوالیار میں محفوظ ہے۔ وجاہت علی سندیلوی نے ''غلطی ہائے مضامین مت پوچھ'' کے زیرِ عنوان ان غلط تصورات کی نشاندہی کی ہے جو عوام میں ان کی ابتدائی شاعری اور مغلق نگاری سے متعلق پھیل گئی ہیں۔ ڈاکٹر حامد حسین نے ''کلام کی

شرحوں'' پر لکھا ہے اور مشہور شرحوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور سترہ شروح سے ایک شعر: ع

''میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد''

کا مفہوم نمونتاً دیا ہے۔ حنیف کیفی بریلوی نے غالب کی خود اشتہاریت (نرگسیت) پر، سید حیدر عباس رضوی نے ایک مضمون ابوالکلام آزاد کی غالب سے عقیدت پر اور ایک رفعت شیروانی کا خط غالب کے نام دیا ہے۔ جناب عبدالقوی دسنوی نے نسخہ بھوپال اول وثانی یعنی حمیدیہ اور بیاض پر سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد نسخہ حمیدیہ اور بیاض کا مطالعہ چنداں اہم نہیں رہتا۔ مظفر حنفی نے نئے نئے شاعروں پر غالب کے اثر کو واضح کیا ہے۔ باقی مضامین بھی غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں اور اس طرح بھوپال کی طرف سے یہ غالب کی بارگاہ میں ایک خراجِ عقیدت ہے۔ ہماری بعض یونیورسٹیاں بھی غالب پر اتنا مواد پیش نہ کر سکیں، سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو قابلِ مبارکباد ہے''۔

(۳)

'ندائے ملت' لکھنؤ، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۰ء

سیفیہ کالج بھوپال سے شائع ہونے والا یہ رسالہ اپنے خاص نمبروں کے ذریعہ اردو کی وقیع خدمت انجام دے چکا ہے۔ ۷۰۔۱۹۶۹ء کا سالنامہ غالب نمبر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے مختلف رسائل نے غالب صدی کے سلسلہ میں اپنے خاص نمبر شائع کیے ان میں یہ امتیازی شان رکھتا ہے۔ نثر و نظم کے اکثر مضمون معیاری اور پُر معلومات ہیں۔ اس کی مجلس ادارت میں سید عبدالقوی دسنوی اور سید حیدر عباس رضوی (شعبہ اردو کے اساتذہ) شامل ہیں۔ دسنوی صاحب کا مضمون نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی بہت ہی اہم تحقیقات کا حامل ہے۔ آخر میں غالب کے کلام کا جو انتخاب بعض خواتین کے نام سے درج ہوا ہے وہ ان کے حسن ذوق کا مظہر ہے۔ حصہ نظم میں تضمین کلام غالب مظفر حنفی صاحب کے قلم سے خوب ہے۔ دوسرے قابلِ ذکر مضامین میں ''غالب کا صحیفہ منسوخ'' از ڈاکٹر گیان چند جین، ''بنام غالب'' از سید حیدر عباس رضوی، ''کلام غالب کی شرحیں'' از ڈاکٹر سید حامد حسین شامل ہیں۔ رسالہ کا پہلا مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے قلم سے ہے۔ (ع۔ق)

علامہ اقبال بھوپال میں (۱۹۶۷ء)

(۱)

''اس کتاب میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال کتنی بار بھوپال گئے، کہاں ٹھہرے، نواب حمید اللہ خاں مرحوم فرمانروائے بھوپال سے کس طرح تعارف ہوا۔ ان کے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہونے کے کیا محرکات تھے۔ سر راس مسعود سے علامہ اقبال کے کس قدر مخلصانہ تعلقات تھے؟ کتاب خاصی دلچسپ اور معلومات آفریں ہے اور اقبالیات میں خوشگوار اضافہ ہے۔''

(ماہنامہ ''فاران'' کراچی، اپریل ۱۹۶۸ء)

(۲)

''عبد القوی دسنوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بھوپال اور والیِ بھوپال سے علامہ کے روابط اور تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال اردو کے ان شعراء میں سے ہیں جن پر غالب کے بعد سب سے زیادہ لکھا گیا ہے لیکن ابھی ان پر شاید بہت کچھ لکھنا باقی ہے اس لیے کہ آئے دن کتب و مقالات شائع ہو رہے ہیں اور ان کی شخصیت و کلام سے لوگ برابر دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہا کہ اقبال پر جو کچھ شائع ہو رہا ہے اس کا زیادہ حصہ لکھا نہیں جاتا بلکہ لکھوایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کے متعلق تضاد و تکرار کا ایک ایسا انبار لگتا جا رہا ہے کہ اس سے کوئی مفید مطلب یا نتیجہ نکالنا مشکل ہو گیا ہے۔ عام طور پر یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے پیرایہ بدل بدل کر اس کو دہرایا جا رہا ہے اور کوئی ایسی بات کم سامنے آتی ہے جو اقبال کے متعلق ہماری معلومات میں کسی طرح کا اضافہ کرتی ہو۔

''علامہ اقبال بھوپال میں'' ہر چند کے بہت مختصر سی کتاب ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال کی شخصیت اور زندگی کے متعلق کچھ ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ برصغیر کی سیاسی و ادبی تاریخ کی بعض ایسی کڑیاں اس کتاب میں مل جاتی ہیں جن کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں آیا اور جن سے آشنائی کے بغیر ملی و

ادبی تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا پھر بھی چوں کہ سر راس مسعود اور نواب بھوپال دونوں سے اقبال کے ذاتی مراسم تھے اور مسلمانان پاک و ہند کی سیاسی وملی تحریکوں سے ان تینوں کا گہرا تعلق تھا اس لیے اس مثلث کے خطوط وزاویوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

زیر نظر کتاب اس ضرورت کو بہر طور پورا کرتی ہے اور ایک روپیہ پچاس پیسے میں سیفیہ کالج بھوپال سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(نگار پاکستان، ستمبر ۱۹۶۷ء)

(۳)

رابندر ناتھ ٹیگور کے سلسلے میں ابھی چند دن پہلے پاکستان میں جو ہنگامہ ہوا وہ نہایت افسوسناک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اس قسم کی ملائیت سے پاک ہے۔ اگر اس قسم کا رجحان یہاں بھی پیدا ہوا تو سب سے پہلے اقبال زد میں آئیں گے۔ کیوں کہ صحیح یا غلط رقیبوں اور فرشتوں نے ان کے سلسلہ میں بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ پاکستان کے بانی اور خالص اسلامی شاعر ہیں۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

بہر حال ہندوستان اقبال کی شاعری سے کسی قیمت پر بھی دست بردار نہیں ہوسکتا اور یہاں ان کے کلام کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوگی اور ان کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے اور پرکھنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

عبدالقوی دسنوی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں عبدالقوی دسنوی صاحب نے ریاست بھوپال سے اقبال کے جذباتی اور مادی تعلق کی تفصیل بڑے دلنشیں انداز میں تحریر کی ہے۔

علامہ اقبال تین بار بھوپال تشریف لائے اور علاج کے سلسلے میں بھوپال میں ان کا قیام تقریباً سوا چار ماہ رہا۔ بظاہر یہ مدت بہت مختصر ہے لیکن اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مختصر مدت اقبال کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عبدالقوی دسنوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اقبال کے بھوپال میں قیام کی داستان کو خلوص اور

اہتمام سے قلم بند اور شائع کیا۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مفید اور قابلِ قدر تحفہ ہے"۔

(شہریار — ہفتہ وار ہماری زبان۔ ۱۵؍جولائی ۱۹۶۷ء)

(۴)

" یہ خوبصورت کتابچہ جناب عبدالقوی صاحب دسنوی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پروفیسر محمود حسین صاحب میسور یونیورسٹی کا ایک مضمون "علامہ اقبال کی داستانِ دکن" سب رس میں شائع ہوا اور علیحدہ کتابچہ کی شکل میں بھی۔ اس میں پروفیسر صاحب موصوف نے علامہ اقبال کے سفرِ میسور سے متعلق تمام واقعات کو ایک جگہ کر دیا ہے اسی طرح پیش نظر کتابچہ علامہ اقبال کے سفرِ بھوپال سے متعلق ہے۔

علامہ اقبال کے گہرے دوست اور سر سید احمد خاں کے پوتے بھوپال میں وزیرِ تعلیم تھے اور انھیں کی ایماء پر نواب صاحب بھوپال نے علامہ اقبال کے علاج معالجہ کے لیے ہر قسم سہولتیں بہم پہنچائی تھیں اور قیام کے لیے شیش محل کا انتخاب کیا تھا۔

علامہ موصوف پہلی مرتبہ ۳۱؍جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۸؍مارچ ۱۹۳۵ء تک، دوسری دفعہ جولائی ۱۹۳۵ء سے ۹؍ستمبر ۱۹۳۵ء تک اور تیسری دفعہ ۲؍مارچ ۱۹۳۶ء سے ۹؍اپریل ۱۹۳۶ء تک بھوپال میں قیام پذیر رہے۔ بحیثیت مجموعی یہ قیام سوا چار ماہ کا ہوتا ہے۔ یہ سوا چار مہینے حیاتِ اقبال کے لکھنے والوں کے لیے تاریکی میں تھے اور صرف اتنا ہی علم ہو سکا تھا کہ علامہ اقبال علاج کے سلسلے میں بھوپال میں قیام فرما تھے۔ اب اس کتابچہ سے دورانِ قیام کی ساری تفصیلات منظرِ عام پر آ گئی ہیں اور حیاتِ اقبال کا ایک گوشہ جو ابھی تک تاریکی میں تھا جناب دسنوی صاحب کی کوششوں سے منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ علامہ موصوف کے سر راس مسعود اور ان کے خاندان سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے اقبال کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح اور دوسرے مقامات تفصیلات بھی لکھنے کی طرف محققین توجہ فرمائیں تو حیاتِ اقبال کی کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔ جناب دسنوی صاحب کی اس کامیاب کوشش کو بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا"۔

(محمد اکبر الدین صدیقی — ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، اگست ۱۹۶۸ء)

"اقبال کی زندگی اور فن پر ہر سال بہت سی کتابیں اور مقالے شائع ہوتے ہیں جن میں ان کی زندگی اور فن کے نئے نئے گوشے تلاش کر کے قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "علامہ اقبال بھوپال میں" بھی انھیں قابل قدر کتابوں میں شامل ہے جن میں اقبال کی زندگی کے ایک دور کا ایک اہم ریاست سے تعلق دکھایا گیا ہے۔ اقبال مستقل طور پر بھوپال میں کبھی بھی مقیم نہیں ہوئے وہ ۱۹۳۵ء کے دوران تین مرتبہ بھوپال آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال زندگی کے آخری برسوں میں کھانسی اور گلے کی تکلیف سے مجبور ہو کر سر راس مسعود کی دعوت پر علاج کے لیے بھوپال میں قیام پذیر ہوئے۔ ان اوقات میں ان کے قیام کی مدت تقریباً سوا چار ماہ ہے۔

مصنف نے نہایت کوشش اور خوش اسلوبی سے اقبال کی زندگی کے اس عرصے کو منظر عام پر لانے کے لیے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے مواد کو ایک مربوط شکل میں پیش کر دیا ہے۔ مصنف نے کتاب کی تصنیف میں اقبال کے خطوط سے بالخصوص فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان حضرات کے بیانات بھی پیش کیے ہیں جنھیں اس زمانے میں اقبال کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا۔

کتاب میں اگرچہ زیادہ تر اقبال کی بیماری کا ذکر ہے مگر ان کی قلندرانہ زندگی کی بہت سی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ اقبال نے بھوپال میں جو نظمیں لکھی تھیں مصنف نے ان کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ اس زمانے میں اقبال ایک نئی کتاب:

" An Interpretation of Holy Quran in the Light of modern Philosophy"

کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ اس کتاب کے سلسلے میں اقبال جو کچھ سوچ رہے تھے اس کے متعلق بھی مفید اشارات ملتے ہیں۔ اقبال کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جو پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا کرے اور یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیاتِ اسلامی کے متعلق جو غلط نظریات قائم کیے ہیں ان کی تردید کر کے دنیا کے سامنے تصویر کا رخ لایا جائے۔

کتابت طباعت عمدہ ہے۔ یہ کتاب اقبالیات کے سلسلے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے''۔

(صحیفہ، لاہور شمارہ ۵۰، جنوری ۱۹۷۰ء)

(۶)

''اقبال اور بھوپال'' بظاہر ایک محدود سا موضوع ہے، اس موضوع کا تفصیلی احاطہ کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک مختصر سا مقالہ عبدالقوی دسنوی، صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال نے تحریر کرنے کا حوصلہ کیا۔ دسنوی صاحب نے اپنے مقالہ کو بعد میں کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کیا اور مجھے بھی ایک کاپی عنایت کی۔ میں نے اسے پڑھا تو افسوس ہوا کہ دسنوی صاحب اپنے مقالہ ''علامہ اقبال بھوپال میں'' کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ پھر بھی میں نے انھیں مبارک باد دی''۔

(اقبال اور بھوپال، از صہبا لکھنوی طبع اول، اپریل ۱۹۷۳ء، ص: ۱۱۔ ۱۲)

(۷)

''علامہ اقبال بھوپال میں'' میں شامل افراد کے بیانات میں رنگ آمیزی سے اس کتاب کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آنے والا وقت خود ہی دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردے گا۔ عبدالقوی دسنوی صاحب کی یہ کوشش اقبالیات میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے اس کی اہمیت کبھی بھی کم نہ ہوگی اور کیوں کہ عبدالقوی دسنوی صاحب ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اقبالیات کی گمشدہ میراث کو ڈھونڈ کر تاریخ کے اوراق میں محفوظ کرلیا ہے۔ ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے''۔

(''ریاست بھوپال اور اقبال'' ماسٹر اختر، اگست ۱۹۸۷ء، ص: ۲۸)

''جہاں تک اصل موضوع کا سوال ہے اقبالیات کے اس نئے موضوع پر جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے اپنی تصنیف ''علامہ اقبال بھوپال میں'' میں صہبا لکھنوی صاحب کی کتاب کے عالمِ وجود میں آنے سے ۶ سال قبل بہت کچھ پیش کردیا تھا جسے بیشتر غیر ضروری اضافوں کے ساتھ صہبا صاحب نے اپنی کتاب کی زینت بنالیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عبدالقوی دسنوی صاحب نے حاصل شدہ مواد کو منصفانہ گھماؤ پھراؤ سے طول یا وسعت دینے کی قطعی کوشش نہیں کی جب کہ صہبا لکھنوی صاحب نے اپنے قلم کے وہ

جوہر دکھائے کہ قطرہ دریا بن گیا''۔

(''ریاست بھوپال اور اقبال'' ماسٹر اختر، اگست ۱۹۸۷ء، ص: ۳۴)

''اقبال اور بھوپال'' میں غیر اہم اور غیر ضروری مواد کی اس قدر بھرمار ہے کہ بعض اوقات موضوع اتنا پیچھے رہ جاتا ہے کہ واپسی مشکل نظر آتی ہے برخلاف اس کے عبدالقوی دسنوی صاحب کی تصنیف جس سے کہ صہبا لکھنوی نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور جس کا انھوں نے اپنی کتاب میں نہایت ہی تضحیک آمیز انداز میں ذکر کیا ہے ان تمام حشو و زوائد سے پاک ہے''۔

(''ریاست بھوپال اور اقبال'' ماسٹر اختر، اگست ۱۹۸۷ء، ص: ۳۴)

(۸)

''قابل مصنف (صہبا لکھنوی) نے اور بہت سی معلومات کچھ کتاب کے موضوع سے متعلق اور کچھ غیر متعلق بھی بہم پہنچائی ہیں۔ اس موضوع پر جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے اپنے مختصر رسالہ موسومہ ''علامہ اقبال بھوپال میں'' ضروری معلومات اختصار کے ساتھ یکجا کر دی ہے''۔

(تبصرہ از عبدالواحد معینی، اقبال ریویو، کراچی جنوری ۱۹۷۴ء)

☆☆

مکتوب سید عبدالواحد مصنف "IQBAL" کراچی
۱۳؍مارچ ۱۹۶۸ء بنام عبدالقوی دسنوی

مکرم بندہ

جناب عباداللہ صاحب فاروقی نے آپ کا نہایت دلچسپ رسالہ ''علامہ اقبال بھوپال میں'' دکھلایا۔ آپ نے معتقدین اقبال کی دلبستگی کا بڑا سامان مہیا کردیا ہے۔ آئندہ نسلیں آپ کی کارگزاری کی قدر کریں گی۔

اس سلسلے میں ایک گزارش خدمت والا میں کرنا ہے۔ ابھی تک بھوپال میں بہت سے ایسے آدمی زندہ ہوں گے جو علامہ کے قیام بھوپال کے دوران ریاض منزل سے وابستہ ہوں گے۔ میرا ناچیز مشورہ ہے کہ آپ ان سے مل کر علامہ سے متعلق ان کے تاثرات نقل کرلیں۔ اور یہ تاثرات کتاب کے دوسرے اڈیشن میں شامل کردیں۔ یہ اصلی ریسرچ ہوگی جس کا موقع آپ کو حاصل ہے۔ علامہ نے قیامِ بھوپال میں امام رازی کی مباحث شرقیہ کسی مولوی صاحب کی مدد سے پڑھی تھی۔ اس کا ذکر اقبالنامہ میں ہے ان سے بھی ملیے۔ الغرض اس طرف ضروری توجہ فرمائیں۔ میرا ذکر آپ نے کتاب کے صفحہ ۶۴ پر کیا ہے۔

نیازمند

سید عبدالواحد

26 D-BLOCK PECHS

KARACHI-29

''بھوپال اور غالب'' (۱۹۶۹ء)

(تبصرے کی روشنی میں)

(۱)

'کتاب نما' دہلی، جولائی ۱۹۶۹ء

غالب کے سوسالہ یادگار منانے کا جب سے غلغلہ بلند ہوا ہے تب سے اب تک خدا جھوٹ نہ بلوائے درجنوں کتابیں، کتابچے اور بے شمار مضامین چھپ چکے ہیں۔ لکھنے والے قلم پکڑ پکڑ کر اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جیسے غازی میاں کے میلے میں شرکت کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس بھیڑیا دھسان کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی کتابوں میں سے اگر آدھے سے زیادہ مسالہ نکال دیا جائے تو شاید کچھ ڈھنگ کی چیز بچ رہے۔ یہ کتاب بھی اسی طرح کی چیز ہے۔

مصنف نے یہ چاہا ہے کہ بھوپال سے غالب کا جو تعلق رہا ہے اور غالب کے جو دوست، شاگرد وہاں تھے ان کا تذکرہ ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے۔ خیال نیک تھا، لیکن احتیاط اور محنت کے بغیر رنگ چوکھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس میں اسی کی کمی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحوں کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک مختصر سے مضمون کا سامان تھا جس کو اس قدر پھیلایا گیا ہے کہ کتاب تو بن گئی لیکن رطب و یابس اور صحیح و غلط سے بھرپور جو روایت مصنف کے ساتھ آ گئی ہے اس کو چھانے پھٹکے بغیر درج گزٹ کر دیا ہے۔ حقائق اور واقعات پر کیا گزرے گی یہ ان کی بلا جانے۔ حد تو یہ ہے کہ یار محمد خاں شوکت بھوپالی کے نام ذوق کی ایک غزل لکھ دی گئی ہے اور کیسی غزل جو خاصی مشہور ہے۔ بس مقطع کا ایک مصرعہ بدلا ہوا ہے اور دو چار لفظوں کی ہیرا پھیری ہے۔ یہ ہے مصنف کی احتیاط اور دیدہ دری کا حال اسی پر پوری کتاب کو قیاس کر لیجیے۔ کتاب کی شروعات غالب کے ایک قطعہ سے ہوئی ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

''مصنف نے لکھا ہے: جنگ آزادی کے متعلق ایک قطعہ کے چند شعر ہیں''۔
جنگ آزادی کا ذکر مذکور کچھ نہیں بلکہ اس کے بیچ میں دہلی جس طرح لٹی تھی اس پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ غرض پوری کتاب اس طرح کی تحقیقی دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔ (نور جہاں)

(۲)

'آج کل' دہلی، جولائی ۱۹۶۹ء

دوسری کتاب ''بھوپال اور غالب'' جناب عبدالقوی دسنوی کی تصنیف ہے۔ اول الذکر کتاب جس قدر احتیاط اور سلیقے کے ساتھ لکھی گئی ہے اس کتاب میں اسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ واقعات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ حشو و زوائد کی بھی بہتات ہے۔ دراصل ایک مختصر سے مضمون کا رسالہ تھا جس سے ایک کتاب بنالی گئی ہے۔ بے احتیاطی کا عالم یہ ہے کہ شوکت بھوپالی کے نام سے ذوق کی ایک معروف غزل درج ہوئی، معمولی تغیرات کے ساتھ مطلع یہ ہے۔

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کے ساتھ

بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئی ایسی کتابیں سخت گمراہ کن ہوتی ہیں''

(رشید حسن خاں)

(۳)

'صدق جدید' لکھنؤ، ۱۲؍ستمبر ۱۹۶۹ء

یہ عبدالقوی دسنوی (مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم وطن اور شاید عزیز بھی) اردو زبان کی خدمت ایک خاص لگن کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ذوق تو انھیں شروع ہی سے تھا اور اب سالہا سال بحیثیت کالج کے استاد اردو کے انھیں اس کے عملی موقعے بھی خوب مل رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا تازہ ترین افادہ یہ کتاب یا کتابچہ ہے غالب و غالبیات پر۔ ہر اعتبار سے دلچسپ خصوصاً غالب کے گیارہ ملنے والوں اور شاگردوں کے حالات اور ان کا کلام۔ ایک آنچ کی کسر ہر تحقیق میں رہ جاتی ہے۔ ص: ۸۱ پر شاہ ولایت علی خاں عزیز صفی

پوری کے حالات کے خاتمہ پر لکھا ہے ''آخری زمانے میں ان کی حیثیت زبردست عالم، شاعر و انشا پرداز کی تھی''... جی نہیں یہ سب حیثیتیں دب دبا کر وہ صرف صوفی صافی رہ گئے تھے۔ مریدوں کا مجمع اور تلقین ذکر و شغل! زندگی میں ہی اپنی قبر تجویز کر کے اس پر مقبرہ بھی تیار کر لیا تھا۔

ہاں ایک بات اور بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک غالی منکر غالب کے قلم سے نکلا ہوا ٹکڑا خدا معلوم اس کتاب میں ''مغلوبیت'' کے عنوان سے کس طرح شامل کر لیا گیا۔ مصنف کے ذوقِ سلیم نے اسے کس طرح گوارہ کر لیا۔

(۴)

'شب خون' الہ آباد، اگست ۱۹۶۹ء

''میں تو یہ کہتا ہوں کہ سیفیہ کالج بھوپال ان بہت سی یونیورسٹیوں سے تو بہتر ہی ہے جنھوں نے غالب کے نام پر ایک صفحہ بھی نہ چھاپا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں بھوپال میں رہنے والے تلامذۂ غالب کے کم و بیش مفصل تبصرے ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ چیز آدھے جز کا رسالہ ''نمونہ مغلوبیت غالب'' مصنفہ شنکر پرشاد جوشؔ ساکن بھوپال ہے جس میں برہانِ قاطع والے قضیہ میں غالب کی مخالفت کی گئی ہے۔ چند اہم لوگوں مثلاً یار محمد خاں شوکت، عباس رفعت، صدیق حسن خاں اور عبدالرحمٰن بجنوری کی تصویریں بھی شاملِ کتاب ہیں۔

(۵)

ماہنامہ 'آہنگ' گیا، اکتوبر ۱۹۶۹ء

''بھوپال سیفیہ کالج کے صدر شعبۂ اردو جناب عبدالقوی دسنوی کے زیرِ نگرانی شعبۂ اردو سیفیہ کالج اپنے محدود وسائل کے باوجود چند برسوں سے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں عملی دلچسپی لے رہا ہے۔ مختلف چھوٹے بڑے علمی رسالے اس کی دلچسپی کا ثبوت ہیں۔ ناممکن تھا کہ ایسی صورت میں جب کہ غالب صدی کے سلسلے میں ہند و پاک کے اخبارات و رسائل بڑے بڑے خاص نمبر شائع کر رہے ہیں یہ علمی ادارہ خاموش رہتا۔

چنانچہ دسنوی صاحب نے ''بھوپال اور غالب'' کے نام سے ایک مفید رسالہ تصنیف

فرما کر اس کے ذریعہ بہت سی ایسی معلومات فراہم کردی ہیں جن سے "غالبیات" سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہت سا ایسا تاریخی مواد مل جائے گا جو غالب سے متعلق تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھا سکتا ہے۔ یہ تصنیف اگرچہ "بقامت کمتر" ہے لیکن قدر و قیمت میں بہتر ہے۔ اس کے خاص ابواب حسب ذیل ہیں:

۱۔ بھوپال آنے کی دعوت

۲۔ بھوپال اور تلامذہ

۳۔ بھوپال میں غالب سے ملنے والے

۴۔ خمسہ بر غزل غالب

نواب صدیق حسن خاں توفیق والیٔ بھوپال جناب نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر اس دور کے ایک جلیل فاضل ایک جلیل مصنف تھے۔ ان کے متعلق غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب کے صفحہ ۱۹۲ پر لکھا ہے "نواب صدیق حسن خاں نے فارسی کی چند نثریں غالب سے پڑھی تھیں"۔

یہ واقعہ کہ نواب صدیق حسن خاں نے فارسی کی چند نثریں غالب سے پڑھی تھیں اس لیے مشکوک معلوم ہوتا ہے کہ خود نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے "شمع انجمن" میں غالب کا مدحیہ تذکرہ کیا ہے مگر اپنے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے۔ نواب صاحب غالب کے متعلق "شمع انجمن" میں رقم طراز ہیں: "از سخنوران نامی شاہجہاں آباد و صاحبِ فکر خداداد است موجد بیانی خوش و مخترع معانی دلکش شیر بیشۂ سخنوری شہہ یار عصر معنی گستری در نثر و نظم طرز خاص دارد و تراکیب دلنشیں ابداع می نمائد"۔

شاید بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ نواب صدیق حسن صاحب نے مشرقی رنگ میں مرزا کی یہ تعریف و توصیف کی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ نواب صاحب نے اس کے بعد ہی یہ تحریر فرما دیا ہے "جمع از اقران بر طرز و ادائے کلام او اعتراضات کردہ اند۔ چنانچہ از ملاحظہ قاطع برہان و ساطع برہان چوں صبح روشن میشود" چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں "از وظیفہ خواران بہادر شاہ پادشاہ دہلی ست مذہب شیعی داشت چناں کہ خود ہم می گوید"۔

"غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسداللہم ہم اسداللہم و ہیچ وقت خود را از شراب

مدام و گردش جام معاف نمی گزاشت"

صفحہ ۱۱۱ سے صفحہ ۱۲۰ تک جناب شنکر پرشاد جوشؔ ساکن بھوپال کا رسالہ "نمونہ مغلوبیت غالب" غالباً اس نقطۂ نظر سے درج کر دیا گیا ہے کہ تصویر کے دونوں رخ ناظرین کے سامنے آجائیں"۔

(سید اختر علی تلہری)

(۶)

'معارف' اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۶۹ء

مرزا غالب مرحوم اگرچہ بھوپال نہیں جا سکے تھے لیکن اس سے ان کا کئی حیثیتوں سے تعلق رہا ہے۔ اردو کے معروف اہلِ قلم جناب عبدالقوی دسنوی نے اس کتابچہ میں ان کے ان تعلقات کا ذکر اور ان کے گیارہ شاگردوں کے جن کا بھوپال سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے حالات محنت سے لکھے گئے ہیں اور غالب کے دو ملاقاتیوں نواب صدیق حسن خاں اور امجد علی اشہری کا بھی ذکر کیا ہے۔ آخر میں بھوپال کے ایک مشاعرہ اور ایک شاعر کے غالب کی غزل پر خمسہ، شنکر پرشاد جوش بھوپال کا ایک معترضانہ مضمون نمونہ مغلوبیت غالب، نسخہ حمیدیہ اور سہا صاحب بھوپال کی شرح دیوانِ غالب "مطالب الغالب" کا بھی اجمالی ذکر ہے۔ اس حیثیت سے یہ نہایت دلچسپ اور غالبیات سے متعلق انوکھے طرز کا کتابچہ ہے۔

(۷)

'نوائے ادب' بمبئی (ندوی نمبر)

اس کتابچہ میں غالب کے بھوپال سے تعلقات اور بھوپال کی غالب سے عقیدت محبت کے کئی خوشگوار پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مختلف مضامین میں ہمیں اس تہذیبی روایت کی جھلک ملتی ہے جس میں اہلِ شہر اپنے شہر سے کسی فن کار کے تعلق اور وابستگی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

فرمانروایان بھوپال میں سے چند غالب کے سرپرست رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھوپال میں غالب کے شاگردوں اور ملاقاتیوں کی فہرست میں متعدد مقتدر اور علم دوست حضرات کے نام نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں میں نواب سکندر جہاں

نے غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ مرزا سے دلّی نہ چھوٹی۔ نذرانے کی رقم بہرحال غالب کو پہنچتی رہی۔

بھوپال اور غالب میں بھوپال کے ان دس شاعروں کے حالات دیے گئے ہیں جنھیں غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان تلامذہ میں شریف حسن خاں شریف پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس طرح مرزا یوسف علی خاں عزیز سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ تشنہ ہیں۔ کتاب میں نواب صدیق حسن خاں اور امجد اشہری دو ایسے حضرات کا تعارف بھی شامل ہے جن کے غالب سے دوستانہ تعلقات تھے۔ کتاب کے آخر میں ''نمونہ مغلوبیت غالب'' نسخہ حمیدیہ اور ایک غزل کے عنوان کے چند مختصر مضامین ہیں جن کے ذریعہ غالب کے فکروفن سے متعلق چند نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اس کتابچہ کے ذریعہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے چند نئے مسائل ابھر رہے ہیں جو تحقیق و جستجو چاہتے ہیں''۔

(۸)

'جامعہ' دہلی، اپریل ۱۹۷۰ء

غالب کبھی بھوپال نہیں گئے تھے مگر نہ غالب کے حالاتِ زندگی میں یا غالب کے خطوط میں کہیں اس کا ذکر ملتا ہے کہ غالب نے کبھی بھوپال جانے کا ارادہ یا خواہش کی ہو۔ مگر مولوی سید امجد علی کے حوالے سے زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف جناب دسنوی صاحب نے لکھا ہے کہ ''نواب سکندر جہاں بیگم نے بھوپال بلانے کی کوشش کی اور تمام اخراجات کی ذمہ داری لی'' اس بیان پر یقین نہیں آتا کیوں کہ ایسی صورت میں غالب کے سوانح نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بھوپال سے جس تعلق کی نشاندہی کی گئی ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

> ''بھوپال سے غالب کی قرابت بھی ہے۔ ڈاکٹر حامد حسین نے اس رشتہ کی کھوج اس طرح لگائی کہ ''یٰسین محمد خاں نواب قدسیہ بیگم کے بھائی معز محمد خاں کے بیٹے تھے جن کی شادی غالب کی اہلیہ کی بھتیجی کی بیٹی اور داغ کی بھانجی خسرو جہاں بیگم ملقب بہ سردار دلہن بیگم سے ہوئی تھی۔ میاں معظم محمد خاں

انھیں کے بطن سے تھے''۔ (صفحہ ۷)

بھوپال سے تعلق کی ایک صورت یہ ہے کہ وہاں ان کے بہت سے شاگرد تھے یہ تعلق اگرچہ براہ راست نہیں ہے مگر شاگرد معنوی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دسنوی صاحب نے اس کتاب میں اختصار سے ان شاگردوں پر روشنی ڈالی ہے اور چند فوٹو بھی شائع کیے ہیں۔ بھوپال کے فخر کے لیے یہ امتیاز کافی ہے کہ غالب کے دو نایاب مخطوطے وہیں سے دریافت ہوئے۔ پہلے کا جو ۱۹۲۱ء میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے زیر تبصرہ کتاب میں ذکر ہے مگر دوسرے کا جو آج کل مقدمہ بازی کا سبب بن گیا ہے سرے سے ذکر نہیں ہے شاید اس کی اشاعت تک اس کی تفصیلات سے محترم مصنف واقف نہیں ہوسکے تھے۔ چنانچہ ابھی حال میں انھوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ:

''نسخہ بھوپال ثانی اس سے پہلے کہ ہم اسے دیکھ پاتے وطن سے بے وطن ہوگیا''۔

(ہماری زبان ۲۲ر مارچ ۱۹۷۰ء)

مختصر یہ ہے کہ غالب یا غالبیات کا بھوپال سے جو گہرا تعلق رہا ہے اس مختصر کتاب میں اچھی طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔

(۹)

روزنامہ 'دعوت' دہلی، ۲۵ر جولائی ۱۹۷۰ء

غالب صدی تقریبات نے پورے ہندوستان میں نہیں بیرونِ ہند بھی غالب کے نام کو ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کو ذہنوں میں تازہ کیا ہے اور اب تو حالت یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب غالب کے عنوان پر آتی ہی رہتی ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات بھی نہیں۔ آخر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا کوئی نئی بات نہیں۔

لیکن یہ کتاب حجم کے لحاظ سے چھوٹی ہونے کے باوجود کیفیت کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ اور استفادہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے اس کتاب کو شائع

کر کے صرف اردو اور غالب ہی کی خدمت نہیں کی ہے بلکہ بہت سی ایسی شخصیتوں کا تعارف بھی کرا دیا ہے جن کی اپنی خاص اہمیت ہے۔

بھوپال میں تلامذہ غالب کے عنوان کے ذیل میں ابوالفضل محمد عباس شیروانی رفعت، نواب یار محمد خاں شوکت، نیز شہیر رامپوری، نحوی دہلوی، جوہر شاہجہاں پوری، زکی مارہروی، عزیز بنارسی، عرشی قنوجی، تمنا مراد آبادی، عزیز صفی پوری اور سید شریف حسن خاں شریف کا تعارف کرایا گیا ہے تو غالب سے ربط رکھنے والے دوستوں کے ضمن میں نواب صدیق حسن خاں اور سید امجد علی اشہری کا تذکرہ موجود ہے۔ خاتمہ سے پہلے نسخہ حمیدیہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

کتاب کے خاتمہ پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے اس کا عنوان ہے ''ایک غزل'' لیکن یہ تحقیقی کارنامہ خشک ہونے کے بجائے لطیفہ سے بھی زیادہ پُر لطف ہے اسے آپ بھی پڑھیے اور محققین غالب کو داد دیجیے۔

مندرجہ ذیل غزل جناب محمد ابراہیم خلیل ہیڈ مولوی ماڈل اسکول بھوپال کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے جو اپریل ۱۹۳۷ء میں اسکول کے میگزین ''گوہر تعلیم'' میں شائع ہوئی تھی جس میں اپریل فول کی سرخی کے ساتھ نیچے نوٹ دیا تھا:

> ''ماخوذ از کتب خانہ نواب فوجدار خاں بوسیدہ اوراق میں غالب کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے''۔

اس میگزین سے دین و دنیا نے یہ غزل شائع کی جس میں تمہیدی عبارت یہ تھی ''مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل'' پھر اپریل ۱۹۳۹ء کے ہمایوں نے اسے شائع کیا اس پرچہ سے جناب مالک رام نے اسے نقل کیا اور اس کے مقطع کو ذکرِ غالب کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۵۰ء اور تیسرے ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں استعمال کیا اور اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب'' مطبوعہ ۱۹۵۷ء میں شامل کیا لیکن بعد میں یہ راز فاش ہوا کہ یہ غزل غالب کی نہیں بلکہ اپریل فول کا تحفہ ہے جس نے اپنی سحر کاریوں سے محققین غالب کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس حقیقت کا انکشاف ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے مضمون ''غالب اور بھوپال'' میں کیا ہے۔

غزل درج ذیل ہے:

شعر نمبر ۱: بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو

شعر نمبر ۹: پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

(۱۰)

ماہنامہ 'برہان' دہلی، اگست ۱۹۷۰ء

"اگر چہ مرزا غالب غالباً بھوپال کبھی نہیں گئے لیکن بھوپال کو مرزا کے نام اور کام کے ساتھ بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد نواب سکندر جہاں بیگم نے ان کو بھوپال بلایا تھا یہیں ان کے دیوان کے مکمل اور سب سے قدیم نسخہ کا سراغ لگا تھا۔ پھر یہاں ان کے تلامذہ اور ان کے ملنے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور یہاں غالب کی مخالفت میں لکھنے والے ان کے کلام کی شرح کرنے والے اور ان کے انداز میں خود اپنے قلم سے ایک غزل لکھ کر ان کی طرف منسوب کر کے محققین غالبیات کی آنکھوں میں خاک جھونکنے والے بھی پیدا ہوئے۔ اس بنا پر بھوپال کو مرزا سے خاص تعلق رہا ہے۔ فاضل مرتب نے اس کتاب میں یہ پوری داستان بڑی خوبی، عمدگی اور محنت سے مرتب کر دی ہے جو غالبیات کے طالب علم کے لیے لائقِ مطالعہ اور قابلِ قدر ہے۔

(۱۱)

ہفتہ وار 'ہماری زبان' دہلی، ۸ر نومبر ۱۹۷۰ء

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے موجودہ صدر عبدالقوی دسنوی صاحب ایک معروف صاحبِ نظر، اہلِ قلم ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی علمی کاموں میں لگے رہنا اور کامیابی کی راہیں تلاش کر لینا موصوف کو خوب آتا ہے۔ اپنے شعبہ کو موصوف نے جس طرح ترقی دی ہے اور اس کے نام کو روشن کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بقول پروفیسر نورالحسن ہاشمی "ہر دل میں اسے کم از کم ایک بار دیکھنے کی ہوس ضرور پیدا ہو جاتی ہے"۔

سالِ گزشتہ غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں دسنوی صاحب نے ایک سے

زائد کتابیں شائع کیں۔ یہ حقیقت بجائے خود ان کے فکر کے تنوع پر دال ہے۔ ''بھوپال اور غالب'' بھی اسی سلسلے کی ایک مختصر کتاب ہے جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کے مطالعہ سے مولف کے قول کے مطابق'' آپ کو غالب سے عقیدت ملے گی اور بھوپال سے محبت نظر آئے گی''۔ اس میں غالب کے بھوپالی احباب، تلامذہ اور عقید تمندوں کے علاوہ ''نسخہ حمیدیہ'' اور ''مطالب الغالب'' کا تذکرہ ملے گا۔ شنکر پرشاد جوش کا مختصر رسالہ ''نمونہ مغلوبیت غالب'' بھی جو اب نایاب ہو چلا ہے اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ مولوی محمد ابراہیم خلیل کی وہ غزل بھی جس کے مقطع میں '' غالب میکش'' تخلص نظم ہوا ہے غلطی سے بعض لوگوں نے مرزا غالب سے منسوب کرلیا تھا آخر میں درج ہے۔

غالب کو جو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی تھی اس کی تفصیل بھی شروع کتاب میں قلمبند کردی گئی ہے۔ اس طرح کتاب میں موضوع سے متعلق تقریباً ساری اہم باتیں آگئی ہیں۔

کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیات اختصار ہے اور یہی اس کا حسن بھی ہے۔ صاف ستھری کتابت، اچھا کاغذ اور سادگی کے باوصف دلکش سرورق مولف کے شستہ اور شائستہ مذاق کا آئینہ دار ہے اور اس طرح یہ کہنا مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ صوری اور معنوی ہر طرح کے حسن سے آراستہ ہے۔ چھوٹی تقطیع پر ۱۲۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپے ہے جو نہایت مناسب ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ گوناگوں خوبیوں کے سبب یہ کتاب خواص اور عوام دونوں میں کافی مقبول ہوگی۔

(محمد انصار اللہ)

☆☆

نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی (۱۹۷۰ء)

ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد، نومبر ۱۹۷۱ء

پروفیسر دسنوی عرصہ دراز سے غالب پر تحقیقات میں مصروف ہیں، اس سے پہلے ''بھوپال اور غالب'' اور ''غالبیات'' جیسی اہم کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ پیش نظر کتاب نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی (یعنی نسخہ حمیدیہ اور نسخہ عرشی زادہ یا بیاض غالب نقوش) تنقیدی مطالعہ کا حاصل ہے۔ نسخہ حمیدیہ کے نسخہ بھوپال اولیٰ ہونے میں کوئی شک ہے اور نہ نسخہ عرشی زادہ یا بیاضِ غالب کے نسخہ بھوپال ثانی ہونے میں کسی کو کلام ہو سکا ہے۔ میں نے اسی نظریہ کے تحت ہندوستان میں چھپے ہوئے مالک رام صاحب کے نسخہ گل رعنا کو نسخہ حیدرآباد اور دوسرے کو نسخہ لاہور کہا ہے۔

پروفیسر دسنوی صاحب نے نسخہ بھوپال کے زائرین یعنی مفتی انوارالحق صاحب (ناظم تعلیمات بھوپال)، جناب ساجد علی صاحب (سابق نائب ناظم تعلیمات مملکت آصفیہ)، سید ہاشمی فریدآبادی (مورخ)، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور پروفیسر حمید احمد خاں (سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حال وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور) اور امتیاز علی خاں عرشی کے بیانات دیے ہیں جس سے اس نسخہ سے متعلق بہت سی باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں۔

نسخہ بھوپال ثانی پر جتنے مراسلے شائع ہوئے اتنا مواد شاید ہی کسی اور کتاب سے متعلق پیش کیا گیا ہو۔ اس میں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ اس کو غالب کا قلمی بتلاتا ہے، دوسرا اور کے نام سے منسوب کرتا ہے اور ثبوت میں ''دمے چندرہا'' والی غزل پیش کرتا ہے۔ تیسرا گروہ کچھ غالب کے قلم کا اور کچھ کسی اور کے قلم کا بتلاتا ہے اور ثبوت میں وسط صفحہ ۲۸ پر ''تا اینجا نوشتہ ایم'' اور بعد کے سطر سے ''از اینجا شروع'' کی تحریر پیش کرتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نسخہ بھوپال ہی کے لیے کیوں ہوں؟ اس سے ہٹ کر کسی اور نسخہ کے نقل کی یادداشت ہو سکتی ہے جو ابھی کسی کتب خانہ میں پڑا ہو یا صندوق میں بند۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ غالب اپنا دیوان نقل کر کے دوستوں کو دینے اور چھپوانے کے بہت دلدادہ... اور شائق رہے ہیں، اسی لیے زندگی ہی میں ان کے

دیوان کے پانچ ایڈیشن مختلف پریسوں سے شائع ہو چکے تھے۔

پروفیسر دسنوی نے اس سلسلے میں جتنے مضامین اور مراسلے شائع ہوئے ان کے اختلافات بھی دیے ہیں اور نسخہ بھوپال اور بھوپال ثانی میں جو اصلاحیں ملتی ہیں اس کی بھی تفصیل دی ہے۔ آخر میں محذوفات کا بھی ذکر ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جو مطبوعہ دواوین میں نہیں ملتے لیکن بیاضِ غالب نقوش کی اشاعت کے بعد مقابلہ کر کے مختلف مضمون نگاروں نے ان کی تفصیلات مختلف رسائل میں دی ہیں۔ اس طرح نسخہ حمیدیہ اور نسخہ بیاض غالب نسخہ بھوپال اولیٰ و ثانی کے متعلق تمام اختلافات ہمارے سامنے آتے ہیں اور کہیں ایک جگہ ہمیں اتنا مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح اس مختصر سی کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہمیں پروفیسر دسنوی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے دیوانِ غالب کا اس طرح ایک ایسا متن دیا جو ہمیں نسخہ حمیدیہ، نسخہ عرشی اور بیاضِ غالب سے بے نیاز کرتا ہے۔ نسخہ حمیدیہ نایاب ہو چکا ہے۔ نسخہ عرشی (زادہ) کی قیمت تین سو روپے ہے جو پڑھنے لکھنے والے کی بس کی بات نہیں۔ بیاضِ غالب پاکستان میں شائع ہوئی اور اس کا حصول آسان نہیں۔ اس لیے ان میں جو کچھ ہے وہ ہمیں اس کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے۔

☆☆

قادر نامہ غالب (۱۹۷۱ء)

(۱)

ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۷۱ء

جناب عبدالقوی دسنوی صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، غالب پر متعدد تحقیقی مضامین اور کتابچے لکھ چکے ہیں۔ اب انھوں نے ''قادر نامہ غالب'' کا متن ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ یہ مختصر اور دلچسپ منظوم کتاب مرزا نے اپنے متبنیٰ عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لیے لکھی تھی۔ گو اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن عبدالقوی دسنوی صاحبؔ نے اس کو اس پروگرام کے مطابق شائع کیا ہے جو شعبۂ اردو، سیفیہ کالج نے بچوں کو عربی فارسی، ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ لکھانے کے لیے بنایا ہے اور جس کے ماتحت وہاں اس نوع کی اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ شروع میں لائق مرتب کے قلم سے ایک مختصر و جامع پیش لفظ بھی ہے۔ اس میں قادر نامہ کے غالب کی تصنیف ہونے کے دلائل تحریر کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ غالب کے قدر دانوں کے حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

(۲)

ماہنامہ ''سب رس'' حیدر آباد، نومبر ۱۹۷۱ء

بعض ادیبوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب غالب کی نہیں، لیکن یہ غالب کی زندگی ہی میں تین دفعہ شائع ہو چکی تھی، اس کا ذکر ڈاکٹر آغا محمد باقر نے کیا۔ امیر مینائی نے ''انتخاب یادگار'' میں اس کو غالب سے منسوب کیا ہے۔ میر افضل علی عرف میرن صاحب نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے بالمشافہ کہا ہے کہ یہ کتاب باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لیے لکھی گئی۔ مالک رام صاحب نے داخلی شہادتوں سے اس کا غالب کی تصنیف ہونا ثابت کیا ہے۔ حیدر آباد کی مطبوعہ ایک کتاب ''چراغ فواید'' مصنفہ شیخ محمد صابر مصنف نے اپنی تصنیف قادر نامہ غالب کی طرز کا بتلایا ہے۔ اس طرح قادر نامہ کے غالب کی تصنیف ہونے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ اس پر فاضل مرتب نے تفصیلی بحث کی ہے

اور شک کو دور کر دیا ہے۔ ترتیب میں دوسرے مطبوعہ قادرناموں کو سامنے رکھا ہے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ تیرہ مطبوعہ نسخے ان کے علم میں ہیں جن میں ترتیب کے موقع پر ان میں سے بعض نسخوں سے مدد لی ہے اور قادرنامہ کو مرتب کیا ہے۔ غالب کی یہ تصنیف بار بار شائع ہونے کے باوجود کمیاب ہو گئی تھی۔ اس اشاعت نے اس کو نئی زندگی عطا کی ہے۔

☆☆

''یادگار اقبال''

(تبصرے اور خطوط کی روشنی میں)

مکتوب پروفیسر رفیعہ سلطانہ بنام عبدالقوی دسنوی

(۱)

۳؍جنوری ۱۹۸۰ء

مکرمی سلامسنون!

نیا سال مبارک

سیفیہ کالج کا دیدہ زیب اور وقیع مجلّہ ہمدست ہوا۔ پہلی فرصت میں تمام مضامین پڑھ ڈالے۔ اس معیاری پرچے کی اشاعت پر میری دلی مبارکباد قبول کریں۔ عموماً کالجوں کے ترجمان اتنے اعلیٰ پایہ مضامین کے ''متحمل'' نہیں ہوتے۔ اقبال اور بھوپال کا تعلق (آپ ہی کی تحقیقات کے بموجب) لازم وملزوم کا سا ہے شاید اسی سبب اقبال کے فکروفن پر آپ کے مضامین اقبالیات کے سلسلے میں اہم کڑیاں ہیں۔ بہرحال ان جامعات میں جہاں جہاں اقبال کے نام کی چیئرز قائم کی گئی ہیں اقبال پر اتنا کام نہیں ہو پایا جتنا ایک کالج (سیفیہ) کے شعبۂ اردو نے کام کیا ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ کی سرکردگی میں شعبۂ اردو دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور بڑی جامعات اس کالج سے کام کرنے کی لگن سیکھیں۔

مخلص۔ رفیعہ سلطانہ

(۲)

مکتوب پروفیسر گیان چند جین بنام عبدالقوی دسنوی

۳۱؍اگست ۱۹۸۰ء

محب مکرم!

فخرو بھائی کی معرفت مجلّہ سیفیہ کا یادگار اقبال نمبر ملا، تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آپ نے بہت ضخیم شمارہ نکالا ہے۔ میں نے سب سے پہلے ''اقبال کی ماخوذ نظمیں'' پڑھا۔ اقبال

صدی تقریبات بھی معلومات آفریں مضمون ہے۔ تنقیدی اعتبار سے بھی معیاری مضامین بکثرت ہیں۔

میں نے اقبال کے کلام کی تاریخی ترتیب کا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ ابھی ۱۹۰۶ء تک پہنچا ہوں۔ سوسوا سو سے زیادہ فل اسکیپ صفحات لکھ لیے ہیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

کوثر صدیقی صاحب نے کمال کر دیا کہ مسجد قرطبہ کا فارسی ترجمہ کر دیا۔

مخلص

گیان چند

(۳)

مکتوب پروفیسر جگن ناتھ آزاد بنام عبدالقوی دسنوی

۵ر ستمبر ۱۹۸۰ء

برادرِ عزیز و محترم تسلیم!

کل آپ کی طرف سے ''یادگار اقبال'' موصول ہوئی اور آج آپ کا عنایت نامہ ع:

من بہ بوئے مست و ساقی پر دہد پیمانہ ہا!

آپ کی زیرِ نگرانی سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ جو خاص نمبر آپ نے شائع کیے ہیں اس طرح کے نمبر یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو نہیں نکال رہے ہیں۔

ان دنوں طبیعت اچھی نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کا کام معرضِ التوا میں ہے۔ ذرا اطمینان کے لمحات نصیب ہوں تو ''یادگار اقبال'' بڑے شوق سے پڑھوں گا اور بڑے شوق سے اس پر ''ادبیات'' میں تبصرہ کروں گا۔ بعض عنوانات اس میں نئے معلوم ہوتے ہیں اگرچہ اقبال پر Repeatation اب بہت ہو رہا ہے۔

معارف کا خط چھپنے کے لیے نہیں تھا۔ ذاتی نوعیت کا تھا۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی محبت ہے کہ وہ میری تحریروں کو اتنے خلوص کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پاکستان کا سفر عمدہ رہا، اخبارات اور رسائل نے جو کچھ لکھا اسے دیکھتا ہوں اور

شرمندہ ہوتا ہوں، تراشے ابھی تک وہاں سے چلے آرہے ہیں۔ اردو اور انگریزی کے کوئی دوسو تراشے آچکے ہیں بعض کو میں نے اپنے Biodata میں شامل کرلیا ہے۔ Biodata ٹائپ ہورہا ہے۔

ٹائپ ہوجانے پراس کی ایک کاپی آپ کو بھیجوں گا۔ ع:

حیف بر جان سخن گر بہ سخندان نرسد

نیازمند

جگن ناتھ آزاد

(۴)

مکتوب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بنام عبدالقوی دسنوی

۶ر ستمبر ۱۹۸۰ء

محب گرامی   تسلیمات!

نصف ملاقات کو بھی ایک زمانہ ہوگیا۔ آپ نے خالد محمود صاحب کے ذریعہ جو سیفیہ کالج میگزین کا اقبال نمبر بھیجا تھا وہ مجھے گزشتہ ہفتے میں مل گیا تھا۔ اس ادبی سوغات کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آپ کے کاموں پر ایک خاص چھاپ ہوتی ہے۔ جیسے اقبال کی شاعری پر اس کی اپنی چھاپ ہے یہ نمبر بھی آپ کے حسن ذوق اور سلیقہ مندی کا آئینہ ہونے کے علاوہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو کیسے انہماک سے اپنے طلباء کی تربیت کررہا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت سے رکھے اور علم وادب کی بہت خدمات آپ انجام دیں۔

آپ کا یہ بھوپال میں اعتکاف کرلینا ہمیں پسند نہیں۔ کسی نہ کسی بہانے دہلی آتے رہیں۔

والسلام

مخلص

نثار احمد فاروقی

(۵)

مکتوب پروفیسر احمد سجاد (رانچی) بنام عبدالقوی دسنوی

۷ر ستمبر ۱۹۸۰ء

محترمی ومکرمی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"یادگار اقبال" ملا۔ خاصہ جامع اور وقیع نمبر ہے۔ اس موضوع پر نئے گوشے نکالنا آسان نہیں مگر اس مجلّہ میں کئی نئے مضامین ہیں۔

"پھر سیفیہ کالج منزل بہ منزل" بھی اس کا ایک اہم باب ہے۔ کالج کی علمی، ادبی اور جملہ مصامین میں اس کے کارناموں اور خدمات کا بڑے سلیقہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس قیمتی تحفہ کے لیے ممنون ومتشکر ہوں۔

خاکسار

احمد سجاد

(۶)

مکتوب محمد انصار اللہ (علی گڑھ) بنام عبدالقوی دسنوی

۱۲ر ستمبر ۱۹۸۰ء

مخدومی   السلام علیکم

آج جلیل عباسی صاحب تشریف لائے۔ آپ کے عنایت کردہ مجلّہ سیفیہ کا یادگار اقبال نمبر پہنچادیا۔ ابن فرید صاحب کا جریدہ بھی ان سے میں نے لے لیا ہے کسی وقت پہنچادوں گا۔

چند روز میں دیکھنے کے بعد کچھ عرض کرسکوں گا۔ ویسے صوری اعتبار سے بہت عمدہ ہے اور مضامین کے عنوانات بھی نہایت متنوع ہیں۔ آپ کے کارناموں پر رشک آتا ہے۔ معلوم نہیں میرے حالات بھی کبھی سازگار ہوں گے یا نہیں۔

محمد انصار اللہ

(۷)

مکتوب ڈاکٹر خلیق انجم بنام عبدالقوی دسنوی

۱۶ر ستمبر ۱۹۸۰ء

برادرم آداب!

''یادگار اقبال'' موصول ہوئی۔

سیفیہ کالج قابل صد مبارکباد ہے کہ اس نے غالب اور اقبال دونوں پر ایسے یادگار نمبر نکالے ہیں جو ان موضوعات پر اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاشمی صاحب، انصاری صاحب اور تمام معاونین کو میری دلی مبارکباد پہنچا دیجیے۔ حضرت ایسے ادبی کارنامے بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے بس کے نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایسے کاموں کے لیے وسائل سے زیادہ خلوص اور لگن کی ضرورت ہے اور وہ آپ اور آپ کے ساتھیوں میں موجود ہے خدا آپ کو سلامت رکھے۔

آپ کا
خلیق انجم

(۸)

مکتوب کالی داس گپتا رضا بنام عبدالقوی دسنوی

۱۹ر ستمبر ۱۹۸۰ء

مکرمی تسلیم!

ابھی ابھی مجلہ سیفیہ (یادگار اقبال) موصول ہوا۔ خوب بہت خوب ظاہر میں اگر حسن یہ ہے تو باطن میں بھی کم نہ ہوگا۔

کیا ایسا ہی مجلہ غالب کے لیے بھی نکالا تھا۔ اگر نکالا ہو تو ایک کاپی مجھے بھیجئے گا۔ میرے غالب کلکشن کے لیے۔

آپ کی خدمت میں ایک خط بھی لکھا تھا اور آپ بیتی نمبر بھی بھجوایا تھا۔ امید ہے مل

گیا ہوگا۔ اگر وقت ملے تو جواب بھی عنایت فرمایئے گا۔

پرسان حال کو بندگی۔

مخلص

کالی داس گپتا رضا

(۹)

مکتوب ابن فرید بنام عبدالقوی دسنوی

۲۲ر ستمبر ۱۹۸۰ء

محترم دسنوی صاحب السلام علیکم

مجلّہ سیفیہ کا اقبال نمبر ''یادگار اقبال'' محترم ڈاکٹر محمد انصاراللہ صاحب کی معرفت موصول ہوا، سراپا سپاس ہوں۔ اس خاص نمبر کے بارے میں لکھنا اس لیے لاحاصل ہے کہ آپ اس میدان کے مرد ہیں پس آپ کی تعریف کرنا گویا آپ کی پیروڈی کرنا ہے۔ آپ نے نوجوان لکھنے والوں اور خاص طور سے سیفیہ کالج کے طلباء کی تحریروں کے ذریعہ ''یادگار اقبال'' کو واقعتاً یادگار بنادیا ہے۔

اس نمبر کی ایک کاپی آپ رفیع الدین ہاشمی کو بھی بھیج دیں تاکہ کتابیات اقبال کی آئندہ جلد میں اس کا حوالہ محفوظ ہوجائے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

میری طرف سے شکریہ اور مبارکباد دونوں قبول فرمائیں۔

والسلام

ابن فرید

(۱۰)

مکتوب پروفیسر اسلوب احمد انصاری بنام عبدالقوی دسنوی

۲۵ر ستمبر ۱۹۸۰ء

مکرمی دسنوی صاحب السلام علیکم

آپ کے کسی شاگرد کے بدست آپ کے کالج کے رسالہ کا خاص نمبر ''یادگار اقبال''

وصول ہوا جس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ بڑی خوبی اور شائستگی کے ساتھ آپ نے یہ نمبر ترتیب دیا ہے۔ بھوپال پر تو اقبال کا خاص طور پر حق ہے۔

خیر اندیش

اسلوب احمد انصاری

(۱۱)

مکتوب رضا نقوی واہی بنام عبدالقوی دسنوی

۲۹ ستمبر ۱۹۸۰ء

مکرمی دسنوی صاحب — السلام علیکم

"یادگار اقبال" کی تین جلدیں ملیں حسب ہدایت ایک جلد گورنمنٹ اردو لائبریری اور ایک جلد ڈاکٹر عبدالمغنی کو بھیج دی۔

یہ شاندار مجلّہ اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین ہیں جنھیں سیفیہ کالج کے نئے اور پرانے طلباء اور اساتذہ نے لکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس دور پُر آشوب میں جب کہ ملک کی بیشتر دانش گاہیں سیاست کا اکھاڑا بنی ہوئی ہیں۔ جہاں علم و دانش کے فروغ کے عوض جہالت، بدامنی اور نراج کو فروغ حاصل ہو رہا ہے وہاں سیفیہ کالج اپنے محدود دائرے میں علمی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیاں خلوص دل سے جاری رکھے ہوا ہے۔

زیر نظر مجلّے میں آپ کی حیثیت Play Back Singer جیسی ہے یعنی روح رواں تو آپ ہیں لیکن کہیں بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آپ خود کو نمایاں کر رہے ہیں۔ ظریفانہ زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ادبی محاذ پر آپ نے لتا منگیشکر کا رول ادا کیا ہے۔ البتہ ایک کمی نظر آئی۔ آپ نے اپنا وہ مقالہ شامل اشاعت کیوں نہیں کیا جسے جشنِ ظرافت (پٹنہ) سمینار میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ کی شمولیت سے اقبال کی ظریفانہ شاعری پر ایک نئی جہت سے روشنی پڑتی۔ آپ کے اس انکسار میں گوتم بدھ کے فلسفہ ردِ ذات کی جھلک ملتی ہے جسے میں خالص "بہاریت" کہتا ہوں۔

علامہ اقبال کے اشعار پر بھوپال کے اقبال (مسعود) کی نظمیں پسند آئیں انھیں

دعائیں کہہ دیجیے۔

والسلام

رضا نقوی واہی

(۱۲)

مکتوب ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی بنام عبدالقوی دسنوی

۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء

محبّ مکرم تسلیمات!

امید کہ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔ اب کی بار آپ جب یہاں تشریف لائے تھے اس زمانے میں میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ مصروفیات بھی گوناگوں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بدقت تمام آپ کی تقریر سننے کے لیے مہاتما گاندھی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پہنچا، لیکن اس کے بعد شدید خواہش کے باوجود گھر آکر آپ سے نہ مل سکا جس کا افسوس آج تک ہے۔ اتفاق ہے جس دن وہ نیک ساعت آئی کہ گھر آؤں اس سے ٹھیک ایک دن قبل آپ واپس جا چکے تھے:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

گزشتہ اتوار یعنی ۵/اکتوبر کو صبح استاذی ڈاکٹر محی رضا صاحب قبلہ سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ موصوف سے دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ انھوں نے مجلّہ سیفیہ کا ''یادگار اقبال نمبر'' عنایت فرمایا۔ اس کرم فرمائی اور برادر نوازی کے لیے سپاس گزار ہوں۔

جس زمانے میں ہم اور آپ ہم سبق تھے اس زمانے سے آپ کے شوقِ مطالعہ، ذوقِ مضمون نویسی اور طباعت کتب و رسائل کی خوش سلیقگی کا مداح بلکہ عاشق رہا ہوں۔ یہ نمبر بھی آپ کی خداداد علمی و ادبی صلاحیتوں کا ایک انتہائی خوبصورت مرقع ہے۔ اس نمبر کے حسن ترتیب، موضوعات کی بوقلمونی اور مضامین کے وقیع مواد کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ صوری و معنوی ہر حیثیت سے یہ یادگار نمبر ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ علی گڑھ میگزین کی یاد آتی ہے۔

اگرچہ نمبر میں خود آپ نے اپنا کوئی مضمون شامل نہیں کیا لیکن ''نگاہ اولین'' بذات خود ایک مکمل مضمون ہے۔ اتنا شاندار نمبر مرتب کرنے پر آپ، مدیران، معاونین اور سب

سے بڑھ کر پرنسپل (پروفیسر) ڈاکٹر شکور خاں صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مخلص

مجاہد حسین حسینی

(۱۳)

مکتوب کوثر چاند پوری بنام عبدالقوی دسنوی

۸/ اکتوبر ۱۹۸۰ء

جناب محترم دسنوی صاحب السلام علیکم

خالد محمود صاحب نے جناب کا مرسلہ ادبی رسالہ ''یادگار اقبال'' دیا بے حد شکر گزار ہوں۔ یہ نمبر حسب معمول شاندار اور بلند معیار ہے۔ نگاہ اولین میں تفصیلات کو سمیٹ لیا ہے۔ مولانا محوی صاحب مرحوم کی نظم بہت ہی عمدہ ہے اور فنکارانہ ہے۔ طلبا کے مضامین آپ کی نظر سے گزر ہی چکے ہوں گے آپ ان سب کو ڈاکٹر ہی بنا کر چھوڑیں گے۔ خدا آپ کو ہر حیثیت سے کامیاب کرے۔

خیر طلب

کوثر چاند پوری

(۱۴)

مکتوب پروفیسر نورالحسن ہاشمی بنام عبدالقوی دسنوی

۱۷/ اکتوبر ۱۹۸۰ء

مکرمی عبدالقوی دسنوی السلام علیکم

آپ کا مرسلہ تحفہ مجلّہ سیفلہ کا ''یادگار اقبال'' نمبر مجھے پچھلے ماہ مل گیا تھا اس عرصہ میں وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا رہا۔ رسید تاخیر سے بھیجنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ تو خصوصی نمبر نکالنے، اسے سلیقے اور خوش نمائی کے ساتھ شائع کروانے میں ماہر ہیں۔ حسب معلوم سابق یہ نمبر بھی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ تعریف کہاں تک کی جائے بقول مومن: ''زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے''۔

سب مضامین بہت خوب ہیں۔ طلبا نے بھی حسب استطاعت اپنی معلومات کا سلیقے

نے اظہار کیا ہے۔ حدیقہ بیگم صاحبہ سے البتہ کہہ دیجیے گا کہ اقبال کی رباعیات جو انھوں نے پیش کی ہیں انھیں اگر چہ خود اقبال نے رباعی سمجھا ہے لیکن دراصل وہ قطعات ہیں رباعی کی تعریف میں نہیں آتے۔ اس پر بحثیں ہو چکی ہیں۔ منیر الحوی صاحب سے کہہ دیجیے گا جناب اختر یزداں محسن ایم۔ اے (ص ۲۴۹) صاحبہ ہیں صاحب نہیں اس لیے وہ "اپنے خیالات بیان کرتی ہیں" نہ کہ "کرتے ہیں"۔

آپ نے سب کی تصویریں مجلّہ میں تو دے دی ہیں لیکن خود آپ کی تنہا تصویر ندارت ہے۔ گروپ میں البتہ نظر آتے ہیں لیکن اسے دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ کے بالوں پر سفیدی نے قبل از وقت حملہ کر دیا ہے۔ خدا کرے یہ اندیشہ غلط ہو۔

خیر اندیش
نور الحسن ہاشمی

(۱۵)

مکتوب ڈاکٹر محمد حسن بنام عبدالقوی دسنوی

۲۱؍اکتوبر ۱۹۸۰ء

محبی تسلیم!

آپ کا خط ملا۔ آپ نے جس دلسوزی اور دردمندی سے مرادآباد والے حادثے کے سلسلہ میں اظہارِ ہمدردی فرمایا ہے اس کے لیے نہایت ممنون ہوں۔

یادگار اقبال مل گیا ہے آپ کا ہر کام پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ اس میں بھی آپ نے اپنی روایت قائم رکھی ہے۔

محمد حسن

(۱۶)

مکتوب رفیع الدین ہاشمی بنام عبدالقوی دسنوی

۱۴؍دسمبر ۱۹۸۰ء

محترم دسنوی صاحب سلام مسنون

آپ کا مرسلہ تحفہ سیفیہ کالج میگزین کا خاص شمارہ بیادِ اقبال آج ہی محمد طفیل صاحب

(نقوش) کے توسط سے ملا۔ اس خوبصورت نمبر کی اشاعت پر مبارکباد قبول کیجیے۔ ممنون ہوں کہ آپ نے اس گراں قدر نمبر سے نوازا۔ خدا کرے آپ ہر طرح بخیر ہوں۔ یہ سطور بطور رسید لکھ رہا ہوں رسالے سے تفصیلاً استفادہ کروں گا۔ انشاء اللہ۔

نیاز مند
رفیع الدین ہاشمی

(۱۷)

مکتوب نیر مسعود بنام عبدالقوی دسنوی

۱۳ر جنوری ۱۹۸۱ء

مکرمی دسنوی صاحب　　　　آداب عرض

ڈاکٹر سلیمان حسین صاحب سے آپ کی عنایت کردہ مجلۂ سیفیہ کی جلد ہفتم موصول ہوئی۔ نہایت ممنون ہوں۔

علامہ اقبال پر اتنی کتابیں اور رسائل کے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں کہ اب ان کے بارے میں کوئی مجموعہ تیار کرنا اور اسے بیک وقت مفید اور دلچسپ بنانا تقریباً محال معلوم ہوتا ہے، واقعی آپ کے سلیقے کی داد دینا پڑتی ہے کہ آپ نے اس مجموعے میں ایسی چیزیں فراہم کردیں جنھیں بے اختیار پڑھنا پڑا۔ یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ ایسی ہی دستاویزی اہمیت کی تحریریں پیش کریں گے۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری اس وقت بھوپال ہی میں ہوں گے۔ امید ہے آپ سے ان کی ملاقات ہوگی۔

آپ کا
نیر مسعود

(۱۸)

مکتوب ڈاکٹر ظل الرحمٰن بنام عبدالقوی دسنوی

۲۳ر فروری ۱۹۸۱ء

برادرم قوی صاحب　　　　سلام مسنون!

مجلّہ سیفیہ موصول ہوگیا تھا۔ جواب میں تاخیر ہوئی۔ ان مجلّات کے ذریعہ آپ نے

نہ صرف سیفیہ کالج بلکہ بھوپال میں اردو کے وقار کو بلند کیا ہے۔

بھوپال کی ادبی شخصیتوں کا تعارف اور مشاہیر کے بھوپال سے تعلق کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ بھوپالیات کو موضوع بنا کر آئندہ جو بھی کام کرے گا اسے آپ کے فراہم کردہ سرمایہ سے بہت مدد ملے گی۔ اقبال اور غالب سے رشتوں کے علاوہ علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، راس مسعود، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، نیاز فتحپوری وغیرہ کا بھوپال سے گہرا قریبی تعلق رہا ہے امید ہے آپ آئندہ ان پر بھی کچھ لکھیں گے۔

بھوپال سے کسی صاف ستھرے ادبی رسالہ کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے آپ کی نگرانی میں سیفیہ کالج کی یہ کوشش اس کی تلافی کرتی ہے اور آپ کے لیے قدر اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔

مخلص

ظل الرحمٰن

☆☆

تبصرے

(۱)

'صدق جدید'، لکھنؤ، ۱۷/۱۰/اکتوبر ۱۹۸۰ء

یادگار اقبال (سیفیہ کالج اردو میگزین)، مدیران حفظان احمد ہاشمی، محمد نعمان انصاری، ضخامت ۳۹۲ صفحات، قیمت درج نہیں۔

بھوپال کی درسگاہ سیفیہ کالج کا یہ مجلّہ جس کے نگراں صدر شعبۂ اردو عبدالقوی دسنوی صاحب (علاوہ اردو کی تدریسی و قلمی خدمات کے غالب اور اقبال سے متعلق اپنی متعدد تالیفات کی بدولت اردو کی دنیائے ادب میں نام و مقام حاصل کر چکے ہیں) کی نگرانی میں اقبال سے متعلق پُر معلومات و دلچسپ مضامین پر مشتمل شائع ہوا ہے۔

یہ مجلّہ ۸۰-۱۹۷۹ء کے خاص نمبر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ تین چار نثری و شعری مندرجات کو چھوڑ کر بقیہ سارے مضامین نظم و نثر اس درسگاہ سیفیہ کے اساتذہ سابق اور موجودہ طلبا کے ہیں جس میں اقبال کے کلام اور پیام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں طلبا و طالبات نے کلامِ اقبال کا جو انتخاب پیش کیا ہے وہ ان کے حسنِ انتخاب اور اقبال شناسی کے شاہد عادل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نگاہ اولین کے تحت حضرت اقبال کو جو تعلق بھوپال سے رہا ہے اس کی کہنا چاہیے پوری تفصیل درج ہے۔ ذیل کے مضامین خاص طور سے ندرت لیے ہوئے ہیں۔ 'علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں'، 'اقبال کا تعارف عالم عرب میں'، 'اقبال اور بچے'، 'اقبالیات اور بھوپال'۔ حصہ نظم میں شاعر جلیل القدر حضرت محوی صدیقی مرحوم کی نظم حضرت اقبال سے جو اگرچہ پہلے بھی شائع ہو چکی ہے بہت خوب اور اقبال کے کلام و پیام کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

آخر میں سیفیہ کالج منزل بہ منزل کے زیر عنوان فیروز بابر صاحب نے قابلِ قدر درسگاہ کی رفتارِ ترقی پیش کی ہے۔

(۲)

روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، ۱۶ر فروری ۱۹۸۱ء

مجلّہ سیفیہ کا یادگار اقبال نمبر

اقبال صدی تقریب کے سلسلے میں جتنی کتابیں، جرائد و رسائل خصوصی نمبر اور مجموعہ مضامین وغیرہ کی صورت میں شائع ہوئیں وہ تعداد ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ اقبال شناسی کے لحاظ سے بھی خزانہ دانش و فہم میں گرانقدر اضافہ ثابت ہوئے اور اسی سلسلہ کی ایک تازہ کڑی سیفیہ کالج بھوپال کا اردو میگزین مجلّہ سیفیہ ''یادگار اقبال'' نمبر ہے، جو بڑی سائز کے ۳۹۰ صفحات اور کئی ایک تصاویر پر مشتمل ہے۔ سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال کے زیر اہتمام ''یادگار اقبال'' کے موقع پر جو تقاریب منائی گئی تھی، زیر بحث جریدہ اس کی دین ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جائے کہ اس ضخیم شمارہ میں اقبال پر روایتی مضامین کے علاوہ ایسا مواد بھی مل جاتا ہے جو اقبال کی ہشت پہلو شخصیت اور ان کی فکر کے بہت بڑے کینوس کے ان حصوں سے اردو والوں کے روشناس کراتا ہے جن پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک میں جگن ناتھ آزاد جیسے بلند قامت والے ادیب اور شاعر نے اور برصغیر ہندو پاکستان میں اور بھی کچھ لوگ مل جائیں گے جو شاعر مشرق اس کی فکری اور شعری سرمایہ کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہے ہیں جس کی ڈور اسلامی اخلاقیات سے جڑی ہے لیکن جسے ایک بلند پایہ نقاد کو اس اعتبار سے بھی کھنگالنا ہوگا کہ عصر حاضر کے فلسفہ سائنس، ٹکنالوجی اور سیاست کو کیا اقبال نے محض ''زر کم عیار'' کا نام دینے پر قناعت کی ہے یا ایک ہمہ عصری نابغہ Intellectual کی طرح اس کے مثبت پہلو سے ہم آمیزی اور ہم رنگی کی راہ بھی دکھائی ہے۔ سیفیہ کالج کے جلسہ میں پروفیسر عبدالحق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا خطبہ اقبالیات کے طلبا کے لیے کتابیات کا کام دے سکتا ہے۔ اقبال مسعود ندوی کا مضمون ''اقبال کا تعارف عالم عرب میں'' بلاشبہ اقبال کی زندگی کے ایسے رُخ پر روشنی ڈالتا ہے جس سے عام اہلِ اردو بہت کم واقف ہیں۔ مقالہ نگار کے الفاظ میں بعض عربی زبان کے مشہور شاعر شوقی کا اقبال سے موازنہ کرتے ہیں لیکن جب اقبال مصر و فلسطین، شام و اندلس کے دورہ پر نکلے اور اپنے

وقت کے اکابر عالم عرب اور جامعہ الازہر کی ممتاز شخصیتوں سے ملاقات و بات چیت کی، مصری نوجوانوں کی تنظیم ''شان المسلمین'' کے بانیوں اور کارکنوں نے ان سے شرف نیاز حاصل کی اور جب ان کی نظموں اور تقاریر کے ترجمے اہل عرب کو سنائے گئے تو وہ شوقی کی انفرادیت کلام کے اعتراف کے باوجود عالم عرب کی ایک قدر آور عہد ساز شخصیت بن گئے۔ غالباً عصر حاضر کا نقطہ آغاز پر ہندوستان کی جن چند شخصیتوں کو نئے مصر کے عظیم صحافی حسین ہیکل سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا ان میں اقبال کا نام سرِ فہرست رہتا ہے اور مسعود ندوی نے جوانوں کے ساتھ بتایا کہ اقبال اپنے دورانِ قیام مصر میں نہ صرف حسین ہیکل سے ملے تھے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک سے وابستہ ان کے ایک فعال شاگرد علامہ رشید رضا کو بھی ہندوستان کی صورتِ حال سے واقف کرانا تھا جو ان دنوں قاہرہ سے ''المنار'' نامی ایک پرچہ نکالتے تھے مصر کی تحریک آزادی کے اولین علمبردار نحاس پاشا نے بھی اقبال سے ملاقات ضروری اور ناگزیر تصور کی تھی۔ مسعود ندوی کے علاوہ ڈاکٹر سید حامد حسین کا مضمون ''علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں'' اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ اقبال نے مغرب کے فکری سانچے سے بھی استفادہ میں کوئی تامل نہیں کیا، برطانوی شاعرہ میری ہور جین ٹیلر، امریکی شاعر رالف والڈو ایمرسن، ہنری ورڈ سورتھ، لانگ فیلو اور الفریڈ سن وغیرہ کے ایک آدھ خیال کو اپنا کر اسے ہندوستانی تہذیب کا لبادہ اڑھایا اور ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تقابلی مضمون مقالہ نگار کی تحقیق و جستجو کا ایک نا قابلِ تردید ثبوت ہے اور افکار مغرب سے اقبال کے متاثر ہونے کی یہ داستان کچھ اور تفصیل چاہتی ہے۔

''نگاہ اولین'' کے زیر عنوان جو اس مجلّہ کا اداریہ ہے اقبال کے سابق والی بھوپال حمید اللہ سے دوستی اور خیر سگالی سے ہٹ کر سرزمین بھوپال پر اقبال کے نقوش قدم کو اجاگر کرتا ہے۔ لیکن ایک سوالیہ نشان بھی پیدا کرتا ہے کہ جس نے سابق ریاست حیدر آباد کے ...عطا کو اپنے ...قرار دے کر مسترد کر دیا تھا اسے بھوپال کے شیش محل اور ریاض منزل میں علالت کے دن گزارتے ہوئے کس طرح سکون ہوا ہوگا۔ ان مضامین کے علاوہ جن دیگر مقالوں کو مجلّہ میں شامل کیا گیا ہے وہ مجلّہ سیفیہ کے نگراں عبدالقوی دسنوی صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال کے معیار ادب اور اس کے مدیران حفظان احمد ہاشمی اور محمد نعمان انصاری کے دقت

نظر پسند کی غماز ہے۔ اس کا ایک حصہ ''سیفیہ کالج منزل بہ منزل'' اس درسگاہ کے مختلف شعبہ جات کی سرگرمیوں کا عکاس اور آئینہ دار ہے۔ اس مجلّہ کا حصہ نظم بڑی حد تک روایتی ہے، اور اس کے نثری حصہ سے ہم آہنگ نہیں۔ کتابت، طباعت اور بائنڈنگ کافی دیدہ زیب ہے اور سرِ ورق پر اقبال کی ذہنی شعاعوں کے سیلِ رواں کا مظہر ہے۔ تجریدی اور تصویری آرٹ کا ایک خوشگوار امتزاج بنانے کی کامیاب کوشش ہے۔

☆☆

حیات ابوالکلام آزاد (۲۰۰۰ء)

خطوط

(۱)

مکتوب پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، علی گڑھ

۲۰۰۰/۵/۳۰ء

مکرمی ومحترمی تسلیم ونیاز

''حیات ابوالکلام آزاد'' کا نسخہ ابھی ملا، بہت بہت دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ اس کتاب کی اشاعت اور مطالعے کا کب سے شوق تھا۔ بارے خدا نے پورا فرمایا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ تبریک وتہنیت کے مستحق عزیز محترم علی نواز دسنوی صاحب ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے اور ہمیشہ شاد وبامراد رکھے۔

کتاب کی اشاعت کی اطلاع مسعود صدیقی صاحب نے لکھنو سے دی تھی انھوں نے کتاب دانش محل سے خرید بھی لی تھی۔ مولانا آزاد کے عقیدت مندوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔

ابھی میں نے صرف فہرست مضامین پر نظر ڈالی ہے اس سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ تفصیلی رائے انشاء اللہ بعد مطالعہ پیش کروں گا۔ لیکن ظاہر ہے اس میں وقت لگے گا۔ حدا کرے آپ بخیر ہوں۔

نیازمند

ریاض الرحمٰن شیروانی

(۲)

مکتوب پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جموں

۲؍جون ۲۰۰۰ء

محبّ گرامی قدر آداب

کیا عمدہ لعل وجواہر سے لبریز خزانہ آپ نے عنایت کیا۔ جزاک اللہ!

''حیات ابوالکلام آزاد'' میرے لیے ایک خزانہ سے کم نہیں۔ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں؟ ابھی یہ کتاب پڑھی تو نہیں ایک سرسری نظر بعض صفحات پر ڈالی ہے اور مندرجہ ذیل چند اشعار نوکِ قلم پر آئے اسی روز جس روز یہ کتاب موصول ہوئی یعنی دو تین روز قبل۔

قطعہ

جناب دسنوی نے کیا حسین تحفہ مجھے بھیجا
کہ جس کو دیکھ کر دل میں سرور آنکھوں میں نور آئے

''حیات ابوالکلام آزاد'' ہے نام اس عطیے کا
مرے پاس اس طرح آیا کہ جیسے اذن سور آئے[1]

ہمارے اک امیر کارواں کی داستاں ہے یہ
کہ جس کو پڑھ کے اہلِ ہند کے دل میں غرور آئے

یہ سرتاج محبانِ وطن کا زندگی نامہ
کچھ آیا یوں کہ جیسے ہاتھ میں لے کر منشور آئے[2]

یہ ہے روداد اک درویش سیرت عالمِ دیں کی
یہ ایسے آئی جیسے سامنے شمعِ شعور آئے

ہماری زندگانی میں یہ بجلی اس طرح چمکی
کہ جیسے طور سے چل کر ضیائے کوہِ طور آئے

عجب تحفہ ہے جو یوں ڈاک کے انبار میں آیا
ادب کی بزم میں جس طرح سے صدر الصدور آئے

یہ کتاب پڑھوں گا اول سے آخر تک اس سے فیض اٹھاؤں گا اور آپ کو دعائیں دوں گا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

نیاز مند
جگن ناتھ آزاد

۱۔ مسرت، جشن، جشن کی دعوت۔

۲۔ خوبصورت بنانے والی اور سنوارنے والی شے۔

(۳)
مکتوب ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی

۱۳؍ جون ۲۰۰۰ء

دسنوی صاحب آداب!

آپ کی کتاب کی وصول یابی کے بارے میں خط لکھ چکا ہوں۔ میں ابوالکلام آزاد کا بہت بڑا مداح اور عاشق ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اتنے بڑے دانشور، ایماندار، سچے اور کھرے انسان بہت کم پیدا ہوئے ہیں اور آزادی کی جنگ میں ان سے بڑا کوئی مجاہد نہیں تھا۔ میں یہ بات کئی سمیناروں میں کہہ چکا ہوں۔ چوں کہ آپ نے ابوالکلام آزاد پر غیر معمولی کام کیا ہے، اس لیے اس پر تبصرہ آسان کام نہیں ہے۔ "ہماری زبان" کا مجروح نمبر اور مجروح مرحوم پر اپنی کتاب سے فارغ ہوکر آپ کی کتاب پر تبصرہ کروں گا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

نیاز کیش
خلیق انجم

(۴)

مکتوب ڈاکٹر خالد محمود، دہلی

۱۴ رجون ۲۰۰۰ء

مشفق محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

آج کا دن کیسا مبارک دن ہے کہ آپ کی جاگتی آنکھوں کے خواب کی حسین تعبیر آپ کے سامنے ہے اور آپ کے وسیع وعمیق مطالعہ کی روشنی میں، طویل عرق ریزی کا عطر اور تحقیقات عالیہ کا بیش بہا مرقع بصورت ''حیات ابوالکلام آزاد'' ہماری آنکھوں کو منور اور مشامِ ادب کو معطر کر رہا ہے۔ بلاشبہ آپ کی یہ تحقیقی کاوش مولانا آزاد کا معتبر اور مستند حوالہ ہے۔ آپ کے شاگردوں کو آپ کے ادبی کاموں کی وجہ سے احساس تفاخر کے کئی مواقع حاصل ہوئے لیکن اس معرکۃ الآرا تصنیف کی اشاعت کے بعد میرا تاثر ہے کہ انھیں تفاخر کا نیا اور شائد سب سے زیادہ روشن اور تابناک حوالہ مل گیا ہے۔ اب وہ مزید فخریہ انداز میں کہیں گے کہ:

''حیات ابوالکلام آزاد'' کے مصنف ہمارے استاد محترم ہیں۔ آپ کی عنایتِ خاص نے ایک ایسا قیمتی تحفہ عطا فرما کر میری جو توقیر بڑھائی ہے وہ میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

فخر کی بات پر مسرت کے ان جذباتی لمحوں کی یاد تازہ ہوگئی جب میں نے سیفیہ کالج کے شعبہ اردو میں پہلا قدم رکھ کر آپ کی شاگردی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے ابتدا ہی سے طلباء میں ذوقِ ادب پیدا کرنے کے لیے جو ماحول سازی کی تھی اس میں عام اساتذہ کی طرح زبانی جمع خرچ اور محض پند ونصائح کے بجائے (اب وہ بھی نہیں ملتا) اپنے آپ کو عملی نمونہ بنا کر پیش کیا تھا۔ پھر تلقین کا نمبر ترغیب کے بعد آیا کرتا تھا۔ تلقین کم۔ اور بعد میں ترغیب زیادہ اور پہلے کا ماحول تخلیق کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے شعبۂ اردو کے طلبا ایک مشترک خاندان کی طرح پیار ومحبت اور ایثار واخلاص کی فضا میں ادب اور آداب کی تعلیم وتربیت اور تہذیب وثقافت کی روح سے آشنا اور ہم کنار ہوئے۔ قدیم طلبا میں اس ماحول کی سرشاری کے اثرات الحمدللہ آج بھی باقی ہیں۔ جب کبھی مل بیٹھتے ہیں تو یادوں کے دریچوں سے اسی ''باغِ عدن'' میں جانکلتے ہیں۔

اس کتاب کے تعلق سے آپ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ میں آپ کے اہلِ خاندان کو مبارکباد اور آپ کے تمام شاگردوں کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں کہ آپ کی جدوجہد مسلسل نے ان کے لیے فخر و مسرت کی نئی راہیں روشن کردیں۔

عزیزی علی نواز دسنوی مجھ سے بہت چھوٹے ہیں مگر آپ کی فراہم کردہ اس اطلاع نے کہ ۹۱۲ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کی اشاعت کے جملہ مصارف خود انھوں نے ادا کیے انھیں بڑا بنا دیا ہے، میرے دل میں ان کے لیے تشکر کے جذبات موجزن ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ دوسرے نوجوانوں کو بھی ان جیسا جذبہ تعمیر اور فکر بلند عطا فرمائے تاکہ ایسے بہت سے کام جو مادی وسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتے ہیں خوش انجام ہوں۔

نیازمند
خالد محمود

(۵)

مکتوب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

۱۸/جون ۲۰۰۰ء

محبّ مکرم   السلام علیکم

گرامی نامہ ملا اور اس سے پہلے کتاب بھی ملی تھی۔ نہایت ممنون ہوں کہ آپ ایسی علمی سوغات سے نوازتے ہیں اور اپنے علمی کاموں میں مجھے بھی شریک کرکے مسرور فرماتے ہیں۔

کام آپ نے کیا ہے تو بطور ایمان بالغیب کہہ سکتا ہوں کہ اچھا اور معیاری ہوگا اور سرسری طور پر دیکھنے کے بعد بھی اس قول سے انحراف کی گنجائش نہیں۔ میری آنکھوں میں موتیابند آگیا ہے۔ آپریشن کرانے جارہا ہوں۔

اس کے بعد تقریباً ایک ماہ تک لکھنا پڑھنا بالکل موقوف رہے گا پھر انشاء اللہ اس کو پڑھوں گا اور آپ کو لکھوں گا۔

آپ کا مخلص
نثار احمد فاروقی

(۶)

مکتوب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۱۹/ جون ۲۰۰۰ء

میرے کرم فرما عبدالقوی دسنوی صاحب

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کی تصنیف فائقہ ''حیات ابوالکلام آزاد'' موصول ہوئی۔ کتاب کیا ہے آزاد انسائیکلوپیڈیا ہے این کار از تو آید و مرداں ہمیں کنند، مولانا پر لکھی گئی دوسری سبھی کتابیں اس کے آگے فروتر ٹھہریں گی۔ دیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ایسے بڑے علمی کاموں کے لیے آپ کو صد وس سال سلامت با کرامت رکھے۔

والسلام

گوپی چند نارنگ

(۷)

مکتوب پروفیسر شکیل الرحمٰن

۱۹/ جون ۲۰۰۰ء

برادرم عبدالقوی دسنوی صاحب   تسلیم!

۱۴/ جون کا کارڈ وصول ہوا۔ شکریہ۔

''حیات ابوالکلام آزاد'' جیسے ہی موصول ہوئی رسید بھیج دی۔ اس عمدہ کام پر دلی مبارکباد پیش کر چکا ہوں۔ ایک بار پھر پیش کر رہا ہوں خوب محنت کی ہے، جی خوش ہو گیا۔ مبارک ہو۔

مخلص

شکیل الرحمٰن

(۸)

مکتوب قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

۱۹؍جون ۲۰۰۰ء

مکرمی و معظمی   سلام مسنون!

امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔

پچھلی بار آپ نے کس قدر کرم فرمایا اسٹیشن تک اس ناچیز کو چھوڑنے تشریف لائے۔ کہ عظمت کی جو نشانیاں بڑے لوگوں میں ملتی ہیں وہ سب آپ کی ذاتِ گرامی میں موجود ہیں۔ مولانا آزاد کی عقیدت اور کارنامہ پر مشتمل جیسی بیش بہا کتاب آپ کے دست مبارک سے نکلی ہے وہ کام جس کی تحقیق و تفتیش اور عرق ریزی کا نتیجہ ایک فرد تو کیا پورا ادارہ بھی مل کر کرنا چاہتا تو ناممکن تھا۔ کاش لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔ خدا کرے ICCR کو اگر آزاد سے اب بھی دلچسپی ہو تو اسے کم از کم انگریزی میں منتقل کر کے بڑے حلقہ تک پہنچا سکتی ہے۔ خدائے پاک آپ کو اچھی صحت اور لمبی عمر سے نوازے اور بہت بہت مبارک کرے۔

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

(۹)

پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی

حبیب منزل، علی گڑھ

۲۷؍جون ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی

۴؍جون کے عنایت نامے کا شکر گزار ہوں جو مجھے تاخیر سے ملا۔ کتاب کی تالیف میں آپ کی محنت کی داد تو پہلے ہی دے چکا ہوں۔ آپ کی جستجو بھی قابلِ تعریف ہے۔ تاریخ ولادت کا تعین آپ کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ مکہ معظمہ سے ہندوستان واپسی کا سال آپ نے ۱۸۹۵ء متعین فرمایا ہے۔ اب تک ۱۸۹۸ء کو ترجیح دیتا رہا تھا۔ بیرونی سفر

کے بارے میں میری رائے آپ کی رائے کے بالکل مطابق ہے یعنی یہ سفر ۱۹۰۴ء میں نہیں ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا لیکن ہوا ضرور تھا۔ دوسفر کی بات بے وزن ہے ۱۹۱۲ء کو مولانا آزاد کی زندگی میں آپ نے جو اہمیت دی ہے اور اس کا ذکر جس انداز میں فرمایا ہے وہ میرے نزدیک اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کی اہمیت پر بھی اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہوتی دراصل میرے نزدیک مولانا آزاد کا سیاسی کارنامہ یعنی ہندوستان میں قومیت متحدہ کا تحفظ بہت اہم ہے اور مولانا کی مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم سے جو آویزش ہوئی اس سے مولانا کی سیرت اور کردار کے کئی پہلو بہت تابناکی سے نمایاں ہوئے مثلاً مولانا کی استقامت، ان کا تدبّر، ان کی شرافت نفسی اور ان کا تحمل۔ میری ناچیز رائے میں کتاب میں یہ پہلو اس طرح نمایاں نہیں ہوا ہے۔ حیات ابوالکلام آزاد میں جو اہمیت آپ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو دی ہے اتنی اہمیت حیات سلیمان میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے مولانا آزاد کو نہیں دی ہے۔ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مولانا کے ساتھ جو شرمناک اور تکلیف دہ واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل کتاب میں کہیں نہیں ملتی ہے، پس اس ضمن میں مولانا کے ایک خط کا مختصر اقتباس دے دیا گیا ہے۔ آپ نے ندوۃ العلماء میں مولانا آزاد کی ایک عربی تقریر کا ذکر کیا ہے جس کے بعض حصوں پر بقول آپ کے مولانا شبلی نعمانی جھوم جھوم اٹھے تھے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ میری نظر سے اس سے قبل مولانا آزاد کی ایسی عربی تقریر کا ذکر نہیں گزرا۔ ذکر سید رشید رضا کے اس عربی تقریر کے اردو ترجمے کا گزرا ہے جو انھوں نے ندوۃ العلماء میں کی تھی اور جس نے سب کو متحیر کر دیا تھا، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد کے علاوہ میرے دادا صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے بھی کاروانِ خیال میں اس کی توصیف کی ہے، کیا کاروانِ خیال آپ کے پیشِ نظر نہیں رہی ہے۔ میں نے ندوۃ العلما کے اس دور کے کسی جلسہ میں جس عربی تقریر کی سب سے زیادہ تعریف و توصیف پڑھی ہے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریر تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ شبلی نعمانی نے اپنی پگڑی سید صاحب کو اوڑھا دی تھی۔ حیات ابوالکلام آزاد میں علامہ شبلی کی جو مدح سرائی کی گئی ہے وہ ان کے شایانِ شان ہے اور خود آپ کی حقیقت

پسندی پر دال ہے۔ مجموعی طور پر یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ مولانا آزاد کی، اردو ادب کی اور تحقیق وتنقید کی ایک بڑی خدمت ہے۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیازمند

ریاض الرحمٰن شیروانی

(۱۰)

مکتوب پروفیسر علقمہ شبلی، کلکتہ

۲۸؍جون ۲۰۰۰ء

مکرم ومحترم دسنوی صاحب! السلام علیکم

میں جون کے اوائل میں گیا اور پٹنہ کے سفر میں رہا، وہاں سے واپسی پر آپ کا گراں قدر تحفہ ''حیات ابوالکلام آزاد'' ہم دست ہوا۔ یہ ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ مولانا آزاد کے سلسلے میں آپ کے مضامین پڑھتا رہا ہوں اور بعض تصانیف سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہے اور اب یہ ضخیم کتاب مولانا آزاد سے آپ کے تعلق خاطر کی مستحکم دلیل ہے، آپ نے نہایت کاوش سے ضروری مواد حاصل کر کے نہایت دقت نظری اور سلیقہ مندی سے ان کی ترتیب وتہذیب کی ہے۔ اس دستاویزی کام کے لیے اردو دنیا آپ کی احسان مندر ہے گی۔ ''ایں کار از تو آید و مرداں ہمیں کنند'' اس تحفہ کے لیے سراپا سپاس ہوں اور آپ کو دلی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

نیازکیش

علقمہ شبلی

(۱۰)

مکتوب ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)

۲۹؍جون ۲۰۰۰ء

دسنوی صاحب آداب!

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ میں شاید پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور مختلف سمیناروں

اور جلسوں میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ مولانا (مولانا ابوالکلام آزاد) جنگ آزادی کے سب سے بڑے مجاہد تھے، ان کا مرتبہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے بھی بڑا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں ان کا حق نہیں ملا۔ حضرت! میں نے انھیں ہرگز نہیں بھلایا جو کام آپ نے کیا ہے وہ نوٹس اور کتابیں اکٹھا کرنے کی حد تک میں کر چکا ہوں لیکن آپ کی اس کتاب کے بعد اس کام کی مزید گنجائش نہیں ہے۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیاز کیش
خلیق انجم

(۱۱)

مکتوب سالک لکھنوی (کلکتہ)

بخدمت عالی حضرت عبدالقوی دسنوی مدظلہ　　　　تسلیمات!

آپ کا فرستادہ انتہائی گراں قدر تحفہ "حیات ابوالکلام آزاد" کئی دن ہوئے مجھ بے بضاعت تک پہنچا۔ رسمی شکریے کے بے جان الفاظ اس احساس ممنونیت کی نمائندگی نہیں کر سکتے جس سے دل ایک جذبۂ فخر سے دوچار ہو رہا ہے۔ آپ نے یاد کر لیا میرے لیے یہ اعزاز ہی بہت ہے۔

میری دانست میں مولانا آزاد پر اس سے زیادہ بھرپور کام اب تک کسی اور اہلِ قلم نے نہیں کیا ہے۔ مولانا آزاد کی عظیم شخصیت پر قلم اٹھانے کے لیے ضرورت تھی کہ حضرت عبدالقوی دسنوی جیسی عمیق المطالعہ اہلِ علم شخصیت سامنے آئے۔ تاریخِ اردو ادب میں آپ کی ذات سے یہ ضرورت پوری ہوگئی۔

آپ کا انتہائی نیاز مند
سالک لکھنوی

(۱۲)

مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس

۹ر جولائی ۲۰۰۰ء

مکرمی   سلام مسنون!

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوئے دو ہفتہ ہو چکے۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کو جواب نہ دے سکا۔ وجہ یہ ہے کہ تقریباً ایک ماہ سے مسلسل طبیعت کی خرابی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ بیماری معمولی نوعیت کی ہے مثلاً کبھی بلڈ پریشر ڈاؤن ہو جاتا ہے، کبھی قبض کی شکایت ہو جاتی ہے اور کبھی خواہش کے باوجود طبیعت کھانے کی طرف راغب نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجہ میں ہمہ وقت جو کیفیت طاری رہتی ہے اس میں یہ جی چاہتا ہے کہ نہ پڑھیے نہ لکھیے بس لیٹے رہیے۔ چنانچہ ۱۵ر جون کے بعد موصول ہونے والے خطوط کے جواب بھی بروقت نہیں لکھے جا سکے کچھ جوابات پرسوں لکھے ہیں کچھ آج لکھ رہا ہوں، کچھ آئندہ پر ملتوی رہیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں میرا مطالعہ بہت محدود ہے تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی تازہ تصنیف ''حیات ابوالکلام آزاد'' اس موضوع پر ایک اہم کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی طوالت بظاہر اس کا عیب معلوم ہوتی ہے لیکن یہی اس کی خوبی اور حسن بھی ہے۔ آپ نے حتی الامکان ان کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے ظاہر ہے کہ تفصیل کے بغیر یہ جامعیت ممکن نہیں تھی اور تفصیل میں بعض اوقات اہم اور غیر اہم کی تفریق دشوار ہو جاتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس تفریق کا قائل بھی نہیں کیوں کہ ایک تفصیل جو آج غیر ضروری معلوم ہوتی ہے عین ممکن ہے کہ وہ بھی کسی اہم دریافت کی بنیاد بن جائے یا ایک بات جسے ہم غیر اہم سمجھتے ہیں اس میں کسی دوسرے شخص کے لیے کوئی اہم نکتہ پوشیدہ ہو۔ اس نقطہ نظر سے آپ کی یہ کوشش قابلِ داد ہے مجھے امید ہے کہ اہلِ نظر اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور آئندہ مولانا آزاد کی حیات و شخصیت پر کام کرنے والوں کے لیے یہ چراغِ راہ ثابت ہوگی۔

مخلص

حنیف نقوی

(۱۳)

مکتوب ماسٹر اختر

بھوپال۔ ۱۲؍جولائی ۲۰۰۰ء

جناب عالی

''حیات ابوالکلام آزاد'' کئی روز سے میرے ہاتھ میں ہے۔ بہت کچھ دیکھ ڈالا۔ جی اب بھی نہیں بھرا ہے۔ یہ آپ کے جوش ولگن اور جگر سوزیوں کا بہترین ثمر ہے جو بجا طور پر مولانا آزاد کی حیات و کارناموں پر ایک مکمل و معتبر رہنمائی کی دعویدار بھی ہے۔

خدا آپ کو ایسا ہی باعمل اور صحت مند و سلامت رکھے۔

خیر اندیش

اختر

(۱۴)

مکتوب حبیب الرحمٰن چغتائی، خدابخش لائبریری، پٹنہ

۱۷؍جولائی ۲۰۰۰ء

باسمہ تعالیٰ

مکرمی عبدالقوی دسنوی صاحب السلام علیکم

میں بے حد شرمندہ ہوں کہ بہت تاخیر سے جواب دے رہا ہوں، آپ کے دونوں خط مجھے مل گئے تھے۔ سب سے پہلے تو کتاب کا شکریہ ادا کردوں کہ بہت عمدہ چھاپی ہے۔ جب تک میں اس کا مطالعہ ٹھیک سے نہ کرلوں تاثرات بیان کرنا بہت مشکل ہے اور اس دوران کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ کتاب پڑھ نہیں سکا ہوں، جستہ جستہ دیکھا ضرور ہے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ کتاب ہذا کی تالیف میں بہت محنت اور خلوص کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی یہ کوشش ادبی حلقے میں بہت پسند کی جائے گی۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

حبیب الرحمٰن چغتائی

(۱۵)

مکتوب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری (کراچی)

مکرمی سلام مسنون!

آپ کا شاندار تحفہ پہنچا۔ طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ آپ کی تالیف ہر لحاظ سے شاندار ہے کیا بہ لحاظ ضخامت کے اور کیا بہ لحاظ کتابت کاغذ اور چھپائی کے کیا بہ لحاظ حسن تالیف وتدوین اور جامعیت مطالب کے اور کیا بہ لحاظ صحت مضامین کے! کسی تالیف میں اس کے سوا اور کیا خوبیاں چاہئیں؟

آپ نے حیات ابوالکلام آزاد کی تالیف کا جو انداز اختیار فرمایا ہے وہ وقت کے معیار وروش کے خلاف ہوا اور خواہ کسی کو پسند نہ آئے لیکن خوب ہے اور اس میں بڑا حسن ہے آپ نے ایک کارنامہ ہی انجام نہیں دیا السابق الاول کا مقام بھی حاصل کرلیا ہے اب مستقبل میں آپ سے خواہ کتنا ہی آگے نکل جائے یہ مقام فخر وشرف نہیں پاسکتا۔ موجودہ اصحاب ذوق اور اہلِ قلم میں تو کوئی نظر نہیں آتا جو آپ کی ہم سری کرسکے۔ میری جانب سے اس کارنامہ پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

آپ کی یہ تالیف مجھے ملی تھی میں نے پڑھنا شروع کردیا تھا، مطالعہ کے دوران میرا شوق اور دلچسپی بڑھتی ہی رہی اور میں نے اسے ختم کر کے ہی دم لیا تھا۔ جواب کے لیے انتظار میں رہا کہ آپ کا گرامی نامہ بھی آتا ہوگا جب کچھ دن گزر گئے تو خیال آیا کہ تحفہ کا شکریہ ادا کرنے اور مبارکباد دینے کے لیے گرامی نامے کا انتظار کیوں؟ آپ نے کتاب کے صفحہ اول پر جو کلمہ تعلیقہ لکھ دیا ہے اس کے بعد اس کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

اب اگر اس میں کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہے یا تحریر وکتابت میں کوئی غلطی یا نقص پیدا ہوگیا ہے یا بحث ونظر کا کوئی دائرہ چھوٹ گیا ہے یا روایت کے مطابق مختلف مباحث کا تعین، ان کی درجہ بندی اور تقسیم وترتیب موجود نہیں ہے اور ایک ہی مبحث کے مختلف اجزاء کتاب کے مختلف صفحات پر پھیل گئے ہیں اور ایک مرتب اور مدون تالیف کے بجائے اس میں ڈائری کا انداز نظر آتا ہے تو یہ اس کے ذوق پسند کی بات ہے کتاب کے عدم معیار کی دلیل نہیں اس سے آپ کے شرف السابق الاول اور آپ کے کارنامے کی اہمیت وافادیت

پر حرف نہیں آتا۔ آپ نے واقعتاً ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اور نہ صرف ابوالکلام کے معتقدین کے دل جیت لیے ہیں بلکہ اہلِ علم اور اصحابِ ذوق پر احسان کیا ہے۔ آپ کی کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ سمجھا جائے گا۔

جو کام ذاتی شوق سے انجام دیے جائیں ان سے اجتماعی یا سب کے ذوق کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ آپ نے یہ کتاب اپنے ذاتی وسائل سے چھپوائی ہے۔ ایسے بڑے کام اہلِ ہمت ہی انجام دے سکتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کے بس کی یہ بات نہیں!

کسی ایسی کتاب کی ضرورت اول روز سے تھی لیکن اس طرف کسی کی توجہ نہ تھی بعض دائروں میں بعض اچھے کام انجام پائے اور بہت مفید مواد جمع ہو گیا۔ لیکن کوئی جامع الاطراف کتاب وجود میں نہ آسکی۔ آپ کے ذوق اور توجہ سے ایک ایسی کتاب مہیا ہو گئی کہ حیات ابوالکلام کے ضمن میں اس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور جزائے خیر دے میں آپ کو ایک بار پھر حیات ابوالکلام آزاد کی تالیف و اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خاکسار

ابوسلمان

۵/اگست ۲۰۰۰ء

(۱۶)
مکتوب مشفق خواجہ (کراچی)

محترمی و مکرمی سلام مسنون!

آپ کی کتاب "حیات ابوالکلام آزاد" کوئی مہینہ بھر پہلے مل گئی تھی۔ معذرت خواہ ہوں کہ اتنی تاخیر سے وصولی کی اطلاع دے رہا ہوں۔ دراصل اس دوران میری اور آمنہ دونوں کی طبیعت ناساز رہی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس گھر کی آبادی دو افراد پر مشتمل ہو اور دونوں بیمار ہوں اس گھر کا کیا عالم ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کی کتاب سے بے تعلق رہا۔ یہ مسلسل میرے مطالعہ میں رہی۔ آپ یقین کیجیے کہ میری صحت

یابی میں اس کتاب کے مطالعہ کا بھی خاصہ حصہ ہے۔ مختلف معائنوں کے لیے دن دن بھر کے لیے میں اسپتال جاتا تو یہ کتاب میرے ساتھ ہوتی تھی اور میں اپنی بیماری ہی سے نہیں ہر چیز سے بے خبر ہو کر اس کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ عام حالات میں اتنی ضخیم کتاب جلدی ختم نہیں کر سکتا تھا۔ پورے مہینے میں یہ کتاب پڑھ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب میں پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کو جس طرح آپ نے آئینہ کر دیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ آپ نے بے شمار ماخذ سے ریزہ ریزہ معلومات جمع کر کے مولانا کی زندگی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں پہلی بار مولانا اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اردو کی ادبی سوانح عمریوں کے ذخیرہ میں ''حیاتِ جاوید'' کے بعد یہ دوسری سوانح عمری ہے جس میں موضوع سے متعلق تمام ضروری کوائف ہی نہیں ملتے بلکہ موضوع کے عہد کی پوری تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے اس لیے یہ کتاب میرے نزدیک کام نہیں کارنامہ ہے۔

مولانا آزاد کی سوانح عمری لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ مولانا ہمارے عہد کے آدمی تھے مگر ان کی زندگی کے بعض گوشے ہم سب کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ ان گوشوں پر بھی آپ نے کافی روشنی ڈالی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ آپ کا اسلوب مولوی عبدالحق کے اسلوب کی طرح عالم و عامی دونوں کے لیے باعثِ کشش ہے۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۱۱/اگست ۲۰۰۰ء

تبصرے

(۱)

ڈاکٹر عبدالمغنی ماہنامہ 'مریخ' پٹنہ، اگست ۲۰۰۰ء

''حیات ابوالکلام آزاد''

''پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب ایک معروف محقق ہیں۔ انھوں نے مندرجہ بالا عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے جو اب تک اردو اور انگریزی میں لکھی ہوئی مولانا کی سوانح عمریوں سے زیادہ مفصل اور جامع ہے۔ اس میں مولانا کی ولادت سے وفات تک کے واقعات مستند طور پر درج کیے گئے ہیں۔ لاتعداد حوالے مختلف اندراجات کے لیے دیے گئے ہیں جن میں خود مولانا کے اپنے بیانات کے اقتباسات بھی ہیں۔ اس کتاب میں بحیثیت ادیب شاعر عالم و خطیب اور مدبر و منتظم مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ متعدد مواقع پر مولانا کے ذہن و کردار پر کیے گئے بعض اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات بھی مصنف نے دیانت و وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ گرچہ ایک اسلامی جماعت پر مولانا کا تبصرہ اور کلچرل امور کے متعلق ان کا رویہ تحقیق طلب ہے۔ مولانا کی طرف ایسی باتوں کی نسبت مشتبہ ہے۔

بیسویں صدی نے پوری دنیا میں جو چند نادر ہستیاں پیدا کیں ان میں ایک مولانا آزاد ہیں جنھوں نے ہندوستان کے میدانِ عمل میں اردو زبان کے ذریعہ اظہار سے یادگار کارنامے انجام دیے اور اس طرح اسلامی ذہن کے ساتھ اردو نثر کی ترقی کا وہ سامان کیا جس کی جہت اور معیار دونوں آفاقی ہیں۔ ملک کی تحریکِ آزادی اور آزادی کے بعد دس سال تک اس کی نئی تعمیر میں مولانا کا حصہ ملک کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے ایک درجہ بھی کم نہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے ہندوستان میں سیکولرزم (مذہبی رواداری) کا سب سے بڑا نشان مولانا آزاد ہی ہیں۔ راقم السطور نے بھی ''مولانا آزاد: ذہن و کردار'' اور ''مولانا آزاد کا اسلوبِ نگارش'' کے نام سے دو کتابیں چند سال قبل لکھی ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے زیرِ نظر کتاب لکھ کر بڑی حد تک مولانا کی صحیح سوانح

نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی کتاب کی پذیرائی اور قدر شناسی عام طور پر کی جائے گی اور وہ ملک کے ہر کتب خانہ کی زینت بنے گی۔

(۲)

ڈاکٹر خلیق انجم

ہفتہ وار 'ہماری زبان' دہلی، ۲۲/اگست ۲۰۰۰ء

مولانا آزاد ہندوستان کی ایسی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر مولانا آزاد اور ان کے سیاسی اور غیر سیاسی ہم عصروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مولانا بیسویں صدی کے ہندوستان کی سب سے بڑی اور اہم شخصیت تھے۔ جنگ آزادی میں جس سیکولر رویے، ایمان داری، دیانت داری اور ذہانت کا انھوں نے اظہار کیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔

وہ جنگ آزادی کے واحد مجاہد ہیں جن کے کسی قول یا فعل سے کبھی بھی فرقہ واریت کی بو نہیں آئی۔ ورنہ کوئی ایسا سیاسی رہنما نہیں ہے جس نے اپنے کمزور لمحوں میں ایسی بات نہ کہہ دی ہو جس کی بنیاد مذہبی یا لسانی یا علاقائی تعصب پر مبنی ہو، لیکن مولانا آزاد کی یہ بدنصیبی تھی کہ اپنوں نے بھی ان پر ظلم کیے اور بیگانوں نے بھی۔

مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کی وجہ سے مسلمان مولانا آزاد کی عظیم شخصیت اور ان کے سیکولر کارناموں کو سمجھنے سے قاصر رہے اور بیگانوں کا یہ حال تھا کہ مولانا مرحوم اس اہم ترین زمانے میں کانگریس کے صدر تھے جب تقسیم ہند کے مسائل طے ہو رہے تھے تو مولانا کو بڑے پُر اسرار طریقے سے کانگریس کی صدارت سے ہٹا دیا گیا۔

اگرچہ مولانا نے اپنی کتاب ''ہماری آزادی'' میں وہ اسباب بیان نہیں کیے جو ان کے کانگریس سے مستعفی ہونے کے باعث تھے۔ یہ اسباب صاف ہیں سردار پٹیل اور پنڈت نہرو خود ہندوستان کے وزیر اعظم کے عہدے کے دعوے دار تھے اور یہ ظاہر تھا کا کانگریس کا صدر ہی وزیر اعظم بنے گا۔

مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور جب ملک آزاد ہوا تو ان کی عمر تقریباً

ساٹھ سال تھی ان ساٹھ برسوں میں ان کی زندگی کے ساڑھے دس سال جیل میں گزرے تھے جس کا مطلب ہے کہ آزادی سے قبل کی زندگی کا چھٹا حصہ انھوں نے قید و بند میں گزارا تھا لیکن مولانا آزاد کو اپنی اس ایثار و قربانی کا کوئی انعام نہیں ملا۔

ہم کسی اور سے کیا شکایت کریں خود مسلمانوں نے انھیں ہمیشہ نظر انداز کیا۔

مولانا عظیم ترین سیاسی رہنما نہیں تھے بلکہ ''ترجمان القرآن'' جیسی کتاب کے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے اپنی دانشوری، نفاست طبع اور جدت طرازی سے مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے اردو صحافت میں ایک نئے باب کا آغاز کیا تھا۔ ان کے مکاتیب کے مجموعے 'غبارِ خاطر'، 'مکاتب ابوالکلام آزاد' اور 'کاروانِ خیال' وغیرہ اردو مکتوب نگاری کی تاریخ کا اہم ترین حصہ ہیں۔ اس سب کے باوجود مولانا مرحوم پر بہت کم کام ہوا ہے۔ ان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی فہرست زیرِ تبصرہ کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ ان کتابوں کی تعداد اردو میں ساٹھ پینسٹھ ہے اور انگریزی میں کل چار۔ ان میں اردو کی پندرہ بیس اور انگریزی کی آٹھ دس کتابیں اور شامل کر لیجیے۔ بس یہ ہے کل سرمایہ مولانا آزاد کی فن اور شخصیت پر۔ ان میں بس پندرہ بیس کتابیں ایسی ہیں جو مولانا کی شایانِ شان ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت کی اور کیا بات ہوگی کہ مولانا کے سوانح پر اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جسے ہم مکمل کہہ سکیں اور جس میں مولانا کے خاندان، خود مولانا کی زندگی، مذہب، ادب، تعلیم، سیاست اور صحافت وغیرہ کے میدان میں ان کے کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا جاتا۔ یہ کام پہلی بار پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے کیا ہے۔ نو سو بارہ صفحات پر مشتمل ان کی زیرِ تبصرہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

دسنوی صاحب ہمیشہ سے مولانا آزاد کے عاشق ہونے کی حد تک مداح رہے ہیں۔ مولانا پر ان کا پہلا مضمون ''لسان الصدق'' انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اردو ادب' کے ۱۹۵۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس موضوع سے ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ انھوں نے مضامین لسان الصدق کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے ''لسان الصدق'' کا پورا فائل کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کیا۔ مولانا پر ان کی دیگر کتابیں ہیں، مطالعہ غبار خاطر (۱۹۸۱ء)، ابوالکلام

آزاد (۱۹۸۷ء)، مولانا ابوالکلام آزاد محی الدین احمد آزاد دہلوی (۱۹۸۸ء)، یادگار آزاد (۱۹۸۸ء)، تلاشِ آزاد (۱۹۹۰ء) اور معاصرین ومتعلقات آزاد (۱۹۹۶ء)

زیر تبصرہ کتاب لکھنے کے لیے دسنوی صاحب کو مرکزی حکومت سے سینئر فیلوشپ ملا تھا۔ اس فیلوشپ کے ساتھ انھوں نے پورا پورا انصاف کیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اس طرح یہ ضخیم کتاب وجود میں آئی۔

''حیات ابوالکلام آزاد'' کو پانچ حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گی ہے کہ ہر ایک مولانا کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ ان تمام ابواب میں تقریباً ۲۳۶ عنوانات قائم کرکے مولانا کی زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے باب اول میں مولانا کے خاندان، ان کی ولادت، ہندوستان میں ان کی آمد، ان کے بچپن کے اہم واقعات، شاعری اور صحافت میں ان کی دلچسپی وغیرہ جیسے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب کے آغاز میں ''الہلال'' کے اجراء کی تفصیلات، پھر مولانا کی زندگی کے کچھ اہم واقعات مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی سے آزاد کے تعلقات، مسجد کانپور کا واقعہ، الہلال اور مرزا غالب، رانچی میں مولانا کی نظر بندی، قرآن کریم کی تعلیم واشاعت، مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے عنوانات کے تحت تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ ہندوستان کی تاریخ اور خاص طور سے جنگ آزادی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ ضخیم کتاب مولانا آزاد کی سوانح اور جنگ آزادی کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر میرا مشورہ ہے کہ دسنوی صاحب کوشش کرکے اس کتاب کو انگریزی اور ہندی میں بھی ضرور شائع کریں۔

(۳)

پروفیسر فردوس قادری

سہ ماہی 'نوائے ادب' ممبئی، جون ۲۰۰۱ء

حیات ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد پر بہت مواد موجود ہے۔ خود مولانا آزاد نے مختلف مضامین لکھے ہیں۔ خطوط اور اپنے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ان کی حیات کے تعلق سے سب سے اہم

ماخذ تو ان کی زبان سے بیان کردہ کہانی ہے جسے ہمایوں کبیر نے انگریز جامہ پہنا کر ''انڈیا ونس فریڈم'' کے نام سے شائع کردیا ہے۔ گو یہ کتاب مولانا کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی لیکن اس کا ایک باب مولانا کی ہدایت پر شائع نہیں کیا گیا۔ مولانا کی وفات کے کئی برسوں بعد جب سے شائع کرنے کا وقت آیا تو اچھا خاصا تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا۔ مولانا کے نزدیک و دور کے اقارب مثلاً مشہور فلمساز و ہدایت کار ناصر حسین اور راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن نجمہ ہپت اللہ نے اپنے اپنے دعوے عدالت کے سامنے پیش کر کے ان صفحات پر اپنا حق ملکیت ثابت کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس تنازعہ میں ایک اہم کردار ہندوستان کے موجودہ وزیر دفاع کی اہلیہ لیلیٰ کبیر نے بھی ادا کیا تھا جو ہمایوں کبیر کی صاحبزادی ہیں۔ بہرکیف وہ باب شائع ہوا، لوگوں نے پڑھا اور کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے مصداق سب کو مایوسی ہوئی کیوں کہ اس باب میں کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی گئی تھی جسے سنسنی خیز یا تحیر آمیز کہا جا سکے۔

زیر تبصرہ کتاب ''حیات ابوالکلام آزاد'' کے مصنف جناب عبدالقوی دسنوی صاحب اردو داں حلقوں میں قابلِ قدر مقام کے حامل ہیں۔ آپ کی تحریریں اپنی شگفتگی اور تنقیدی و تجزیاتی بصیرت سے مزین ہوتی ہیں۔ اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے موصوف نے بے انتہا عرق ریزی کی ہے۔ جس کا اندازہ کتاب میں دیے گئے بے شمار اقتباسات اور حوالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے محاسن میں مواد کی تاریخ وار ترتیب اور دسنوی صاحب کی تازہ کار و پر اثر تحریر کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ مولانا کی شخصیت اور خدمات پر درکار کئی دوسری کتابوں میں ان خصوصیات کا فقدان ہے۔

یہاں ایک دلچسپ باب کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے جو مولانا کی شاعری سے متعلق ہے۔ دسنوی صاحب نے بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد مولانا آزاد کی شعری کاوشوں کے بارے میں تمام ضروری مواد مہیا کر کے اس باب میں شامل کردیا ہے۔ مولانا کے سیاسی کارناموں اور ان کے نثری شہ پاروں سے تو ہر کوئی واقف ہے، لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مولانا شاعری بھی کرتے تھے اور ان کے نام کا لاحقہ ''آزاد'' دراصل ان کا تخلص تھا۔ دسنوی صاحب کی تحقیق کی رو سے مولانا اس وقت شاعری کی

طرف راغب ہوئے جب ان کی عمر بمشکل گیارہ سال تھی۔ اتنی کمسنی ہی میں مولانا نے ایک طرحی مشاعرہ کے لیے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک غزل کہی تھی۔ طرحی مصرع تھا:

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا کی غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے:

آزاد بیخودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مختصراً اس ضمن میں فراہم کردہ تمام تفصیلات انتہائی معلوماتی ہیں، جنھیں دسنوی صاحب نے بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے۔

مولانا آزاد کی شخصیت کا احاطہ کرنا بجائے خود ایک دقیق کام ہے۔ ان کے سیاسی عقائد، مذہبی افکار، جدوجہد آزادی میں ان کا کلیدی رول، ان کے محبسی ایام، ان کے خطبات، ان کے مکتوبات، ان کی کتابیں، ان کے مقالات، ان کی صحافتی خدمات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے قاری کے سامنے ان کی پہلودار شخصیت اور ان کے سیاسی کارناموں کو آئینہ کر دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم کتاب پڑھنے کے بعد پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا پر دستیاب لٹریچر کے انبار میں یہ کتاب یقیناً اہمیت کی حامل ہے۔ کتابت، طباعت، جلد بندی، سرورق غرض ہر چیز اعلیٰ معیار کی ہے۔ کتاب کی قیمت نو سو روپے اردو کے عام قاری کے لیے یقیناً بہت زیادہ ہے تاہم کتاب کی ضخامت (۹۱۲ صفحات) کے پیش نظر یہ مناسب لگتی ہے۔

(۴)

ماہنامہ 'معارف' (مئی ۲۰۰۱ء)

''حیات ابوالکلام آزاد'' جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی

متوسط تقطیع، اعلیٰ کاغذ و طباعت اور عمدہ کتابت، مجلد مع گرد پوش

صفحات ۹۱۲، قیمت: ۹۰۰ روپے

پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

اس ضخیم کتاب کے فاضل مصنف مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے افکار و خیالات

اور طرزِ تحریر وتقریر کے عاشق وشیدائی ہیں۔ مولانا کے متعلق ان کی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس طرح زیرِ نظر کتاب گویا عشرہ کاملہ ہے۔ جس کی تالیف کا سبب یہ احساس تھا کہ مولانا مرحوم کے شایانِ شان ایک مفصل سوانح حیات کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ مولانا آزاد نے مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک خط لکھا تھا کہ ''لوگ... میرے حالاتِ زندگی نہیں لکھ سکتے، صحیح وقت اس کا میرے بعد آئے گا، کیوں نہ اس کا انتظار کیا جائے''۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے قریب پچاس سال بعد کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اس کا صحیح وقت آیا سخت محنت وتحقیق اور دستیاب وکمیاب نایاب مراجع ومصادر کے وسیع مطالعہ کے بعد گزشتہ صدی کے نصف اول کی ہشت پہلو اور نابغہ روزگار شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ عروج وزوال میں ہندوستان خصوصاً اسلامیانِ ہند کی تاریخ مرتب ہوگئی ہے، جس کا ہر نقش عبرت ونصیحت کی تصویر ہے۔ اس حیات آزاد کو سنین کے لحاظ سے پانچ حصوں یعنی ۱۸۸۸ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۴۸ء میں تقسیم کیا گیا ہے، اس ترتیب سے پیدائش سے وفات تک کی داستان مسلسل ومربوط اور گویا متحرک ومحسوس شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے خیالات کے اظہار سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور واقعات کو اصل اور صحیح شکل میں دیکھنے کے لیے اقتباسات کو بہتر ذریعہ سمجھا ہے، اس سے اقتباسات کی کثرت اور طوالت غیر معمولی ہوگئی ہے، اس میں احتیاط کی جاتی تو کتاب زیادہ سڈول اور اس کی تاثیر زیادہ قوی ہوتی مثلاً جمعیت، دعوت وتبلیغ اسلام میں تین صفحات کے مکمل خط کی بجائے صرف یہ اقتباس شاید کافی ہوتا کہ ''جماعت اہلحدیث کی تنظیم کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ مختصر بھی مطول سے کم مشکل نہیں، بڑی مصیبت یہ ہے کہ جماعت اہلحدیث بھی اپنے اصل ذوق اور ذہنیت سے ہٹ گئی ہے۔ ایک لاعلاج مرض، حد درجہ پستی فکر ومعیار نظر کا پیدا ہو گیا ہے، مبتدعین ومقلدین کی نصرانیت کے مقابلے میں یہاں ظاہر پرستی وتقشف کی یہودیت سرایت کر گئی ہے''۔ باب دوم اور امور کے علاوہ ندوہ، علامہ شبلی، دارالمصنفین، مولانا سید سلیمان ندوی ومولانا دریابادی کے تعلق سے بڑا جامع ہے۔ دارالمصنفین سے تعلق کا اظہار اور جگہوں پر بھی ہے لیکن اس میں مولانا مرحوم کی اس

تقریر کا ذکر رہ گیا جو انھوں نے دار المصنفین کی امداد کے سلسلے میں پارلیمنٹ میں کی تھی، تقسیم ہند کے پُر آشوب دور کی داستان ہونے کی وجہ سے خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہے۔ فاضل مصنف مشاق اہلِ قلم ہیں، لیکن ضخامت کی وجہ سے شاید ان کو نظر ثانی کی فرصت نہیں ملی۔ کتابت کے اغلاط کے ساتھ بعض عبارتوں پر توجہ کی ضرورت تھی، مثلاً مکہ میں ابتدائی تعلیم کے بیان میں ماضی شکی کے افعال کی گردان نظر آتی ہے، اسی طرح چار سطری ایک اقتباس میں ''پڑھائے، پڑھائی، پڑھایا، پڑھ لو، پڑھائی گئی اور پڑھائی شروع ہوگئی'' کی تکرار ہے۔ اردو کی صحافتی سرمایہ، مولانا آزاد کو زور دیا گیا تھا، شاعری کی طرف رجوع ہوئے وغیرہ جملے بھی ہیں، سڑھ بیٹا بھی نامانوس ہے۔ مولانا محمود الحسن دیوبندی کو ابوالحسن دیوبندی اور تہافۃ الفلاسفہ درخش کا دیانی۔ عزل و استقلال اور مصاف کی جگہ مخارج وضروریات جیسی کتابت کی غلطیاں ہیں۔ لاتعسر کو لاتعثر، جاھدوا کو جاھنوا، لسان صدق کو لسان الصدق لکھ دیا گیا ہے وانھی ان المنکر بھی ہے۔

(۵)

رسالہ ''روحِ ادب'' کلکتہ (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء)

''حیاتِ ابوالکلام آزاد''

مصنف : عبدالقوی دسنوی — ضخامت: ۹۱۲ صفحات

اشاعت : ۲۰۰۰ — قیمت: ۹۰۰ روپے

ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

مبصر : علقمہ شبلی

مولانا ابوالکلام آزاد ان تابناک شخصیتوں میں سے تھے جن کی تابنا کی صرف ان کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ زندگی کی تاریک راہوں کو بھی منور کرتی رہی۔ مولانا کی شخصیت کی یہ تابنا کی مذہب، سیاست، صحافت، ادب ہر میدان میں اپنا جلوہ دکھاتی رہی۔ مولانا کی یہی ہمہ گیر شخصیت تھی جس نے بالغ نظر اہلِ قلم حضرات کو مولانا کی ذات وصفات پر قلم

اٹھانے کی دعوت دی اور متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں جن سے اس نابغۂ روزگار کی حیات و خدمات کے نئے نئے گوشوں کی نقاب کشائی ہو رہی ہے۔

پیشِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دسنوی صاحب کا تعلق بہار کے اس مردم خیز خطے سے ہے۔ جس کی خاکِ پاک سے مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسی عظیم شخصیتیں منصۂ شہود پر آئیں۔ دسنوی صاحب مولانا آزاد کی شخصیت اور عظمت سے اپنی ابتدائے عمر ہی سے متاثر تھے۔ چنانچہ "پیش لفظ" میں رقم طراز ہیں:

> "میرے دل میں مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے ایک خاص احترام کا جذبہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب میں اپنے وطن دسنہ کے مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کتب خانہ الاصلاح اپنے بزرگوں کے ساتھ اکثر جایا کرتا تھا۔ یہیں پہلی بار "الہلال"، "البلاغ" اور "الہلال ثانی" کی مکمل جلدیں دیکھیں... یہیں مولانا آزاد کی بعض یادگار تصویریں بھی دیکھنے میں آئی تھیں"۔

(صفحہ ۲۲۔ ۲۳)

عمر اور مطالعہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس تعلق و احترام میں اور استحکام آتا گیا اور مولانا کی شخصیت زیادہ محبوب و معزز ہوتی گئی اور اسی کے نتیجے میں مولانا آزاد پر دسنوی صاحب کا پہلا مضمون ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دسنوی صاحب کی متعدد کتابیں مولانا آزاد کے تعلق سے شائع ہوئیں۔ جن میں "ابوالکلام آزاد" (ساہتیہ اکادمی، دہلی)، مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی" (بہار اردو اکادمی، پٹنہ)، "یادگارِ آزاد" (اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ) اور "تلاشِ آزاد" (مہاراشٹر اردو اکادمی، ممبئی) شامل ہیں۔

"حیاتِ ابوالکلام آزاد" دسنوی صاحب کی شاہکار تالیف ہے جو ۹۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ضروری مواد کے لیے دسنوی صاحب نے مختلف وقتوں میں دسنہ، پٹنہ، کلکتہ، دہلی، علی گڑھ، ممبئی اور حیدر آباد کا سفر کیا اور مولانا آزاد کی تحریروں اور ان سے متعلق نگارشات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تاکہ مولانا کی صحیح تفصیلی سوانح حیات کی کمی پوری ہو سکے۔ مولانا کی ولادت (۱۸۸۸ء) سے وفات (۱۹۵۸ء) تک کے دور کو آسانی کے

لیے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصے میں مولانا کی زندگی کے اہم واقعات و حالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس مقصد سے مولانا کے متعلق مختلف کتابوں اور مولانا کی تحریروں سے طویل اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

مولانا آزاد کی زندگی کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں خاصا اختلاف ہے۔ بسا اوقات یہ اختلاف مولانا کی اپنی تحریروں کی وجہ سے بھی ہوا ہے۔ دسنوی صاحب نے ان تمام اختلافات کو نگاہ میں رکھا ہے او دقتِ نظر سے ان پر بحث کر کے کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے تا کہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ مولانا آزاد نے ''تذکرہ'' میں اپنا سنہ پیدائش ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ لکھا ہے۔ مولانا کے سوانح نگاروں نے اس روشنی میں صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے ان میں سے بیشتر حضرات کا غالب رجحان ستمبر ۱۸۸۸ء ہے۔ صرف پروفیسر ہمایوں کبیر نے ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء لکھا ہے۔ اختلافِ آرا کا ذکر کرنے کے بعد دسنوی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''مالک رام صاحب کا فرمانا بجا ہے کہ مولانا آزاد نے ''تذکرہ'' میں اپنی تاریخ پیدائش ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی ہے، جس کے مطابق ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۹ راگست سے ۶ رستمبر (۱۸۸۸ء) کے درمیان ہوگی، لیکن مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ انھیں خود مولانا آزاد نے ۷ راگست ۱۸۸۸ء اپنی تاریخ پیدائش بتائی ہے۔ اس لیے ۷ راگست یا پھر ۹ راگست کو تاریخ پیدائش مان لینا چاہیے مگر ماہِ ذوالحجہ (۱۳۰۵ھ) ۷ راگست کو نہیں پڑتا اس لیے میرے نزدیک ۹ راگست (۱۸۸۸ء) ہی کو تاریخ پیدائش مان لینا مناسب ہے''۔ (ص:۶۱)

دسنوی صاحب نے نہ صرف سیاسی محاذ بلکہ دوسرے محاذوں پر بھی مولانا آزاد کی حقیقت پسندی اور وسعت نظری کا تذکرہ تاریخی حوالوں سے جا بجا کیا ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے لیکن آج بھی ہماری لسانی منظر نامہ واضح نہیں ہے۔ اور زبان کے سلسلے میں احتجاجات یا شکایات کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ مولانا آزاد نے مولانا غلام رسول مہر کو ۲۵ رجنوری ۱۹۳۵ء کے ایک مکتوب میں اقلیت کی زبان کے مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کس دوراندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

"اس عقل فروش... نے وحدتِ زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرلس اسکولوں کی سرکاری اعانت بند کر دینی چاہی ہے مگر اتنی واضح بات سامنے نہ آئی کہ اگر ٹھیک ان ہی دلائل کی بنا پر کل کو بہار، یوپی، مدراس، آسام اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟"

مولانا آزاد کی حیات و خدمات کے تعلق سے دسنوی صاحب کی یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ مولانا آزاد پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ زبان سلیس و شگفتہ اور بیان پُر اثر و دل پذیر ہے۔ کتابت و طباعت واضح اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت بظاہر کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن طباعتی اشیاء کی ہوش ربا گرانی اور کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے غیر مناسب نہیں ہے۔ ہر قابلِ ذکر لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ باذوق حضرات کے ذوقِ مطالعہ کی آسودگی یقیناً اس سے ہوگی اور عام حضرات کو بھی اس کا مطالعہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات سے روشناس ہونے میں معاون ہوگا۔

"بمبئی سے بھوپال تک"

تبصرے

(۱)

سہ ماہی "تمثیل" بھوپال (جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء)

کتاب کا نام	:	بمبئی سے بھوپال تک
مصنف	:	عبدالقوی دسنوی
موضوع	:	یادیں — صفحات: ۲۵۶
ناشر	:	۲۔ پرنس کالونی، عیدگاہ ہلز، بھوپال
مبصر	:	اقبال مسعود

"بمبئی سے بھوپال تک" دو شہروں کی نہیں، تین شہروں، تین ادبی مراکز بلکہ ایک تہذیب، ایک عہد اور ایک خاص مزاج کی داستان ہے جس کو خونِ دل سے کشید کیا گیا ہے جو دردمندی، اردو دوستی اور وطن دوستی کی مظہر ہے۔ یہ داستان کہنے کو تو پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی یادداشتوں پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت یہ نوحہ ہے، ہماری تہذیبی، علمی اور اخلاقی زوال پذیری کا، یہ تازیانہ ہے کہ اب بھی اگر نہ سنبھلے تو تاریخ کا مورخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گا اور ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

"بمبئی سے بھوپال تک" ایک رودادِ سفر ہے، زندگی کی بھی اور واقعات و حادثات کی، علمی اداروں کی ترقی اور زبوں حالی کی، طلباء و اساتذہ کے تعلقات اور سیاست گیری کی، اردو کے استحصال اور وطن دشمن تحریکوں کی مگر ان سب کے باوجود ایک امید کی شعاع اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشن ہے۔ حالی کے مٹی کے دیے کی طرح جو راہ دکھاتی ہے اور مستقبل کو درخشاں کرنے کے لیے جستجو، ہمت اور ولولہ بیدار کرتی ہے۔

یہ داستان ہے ایک تعلیم گاہ کے استاد کی، جس نے اپنی محنت اور لگن سے علمی دنیا میں اپنا نام روشن کیا اور جس کی شب و روز کی نگہداشت اور محنت سے اردو کو کئی اہم قلم کار نصیب

ہوئے جواب برگ و بار لا رہے ہیں اور روشنی کے نقطوں کی شکل میں کہکشاں سی بنا رہے ہیں۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' میں کچھ یادیں، کچھ تجربات اور کچھ ردِ عمل ہیں۔ دسنوی صاحب کی زبان سادہ اور پرکار اسلوب، دلچسپ اور بیان رواں دواں ہے۔ قاری پہلے صفحہ شروع کرتا ہے تو آخری صفحات تک پڑھتا چلا جاتا ہے، نہ کہیں رکاوٹ، نہ پیچیدگی نہ گنجلک اور یہ نتیجہ ہے گہری ہمدردی، فکری بالیدگی اور موضوع کے ساتھ مخلص ہونے کا۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ باب اول دیسنہ، بمبئی اور بھوپال کے شب و روز اور باب دوم میں چند تحریریں شامل ہیں باب اول میں ذیلی عنوانات کے تحت تقریباً یک صد علمی، مذہبی اور ادبی افراد کا ذکر ہے۔ جشن، جلسے اور پروگراموں کی تفصیلات ہیں، جب کہ باب دوم میں اقبال، سیفیہ کالج، ملا سجاد حسین، ملا فخر الدین، قصہ ایوان ملا رموزی اور چند خطوط شامل ہیں۔ یہ سب مل کر ایک کڑی بناتے ہیں جو خود پروفیسر موصوف کے الفاظ میں:

> ''میں آدمیت اور احترام آدمی'' پر شروع سے نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اسے اپنی زندگی کا اہم حصہ سمجھتا ہوں... جنگ و جدال سے مجھے نفرت ہے۔ قتل و غارت گری اور بربریت کو نہ صرف درندگی بلکہ ''زوال آدم خاکی'' سمجھتا ہوں''۔

> ''یقین کریں کہ میں بار بار خدا کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے سیفیہ کالج کی خدمت کرنے کا موقع دیا... اس سرزمین تال وتلیا، کوہ و کہسار، سبزہ و سبزہ زار، گل و گلزار، نمونۂ کشمیر، جنتِ نظیر، فردوس گوش، بلائے ہوش، شہر بھوپال دارالاقبال میں زندگی کا بیش قیمت حصہ لگانے کے حالات پیدا کیے''۔

> ''اردو کے ان خدمت گزاروں کے نام جو نہایت خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اردو کو نقصان پہنچانے والوں اور مفاد پرستوں کو سازش کے باوجود اردو کو گھروں میں زندہ رکھنے اور ترقی کی بلند ترین منزل تک لے جانے کا عزم رکھتے ہیں''۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی اردو کے مخلص خادم، بھوپال کے عاشق، وطن دوست اور ''ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں'' پر یقین رکھنے والے، صاحب طرز ادیب،

مشکل پسند ناقد اور معتبر محقق ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کے عشق میں مبتلا ہیں، تب ہی تو کتاب کی قیمت کی جگہ لکھا ہے ''اردو کی خدمت'' ع:

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

حرفِ آخر یہ کہ اس خوبصورت، مجلد، طرحدار اور سفید کاغذ پر طباعت شدہ کتاب کے کور پر Poppy کے پھولوں کی تصویر کھلے آسمان کے پس منظر میں کتاب کے موضوع کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتی، یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کتاب کی اشاعت، طباعت، جلد سازی اور کور کے ہر ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ کور کتاب میں شامل ہی نہ کیا جاتا۔

(۲)

پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' بھوپال (یکم جون ۲۰۰۴ء)

تبصرہ نگار: رشید انجم

ماضی موضوع بھی ہے، دورِ گزشتہ بھی اور تلخ و شیریں یادوں کا بیش قیمت سرمایہ بھی۔ اس دورِ گم گشتہ کو جب موضوع بنایا جاتا ہے تو انسان کا ذہن اور اس کا ذہن اور اس کا شعور عصری تقاضوں سے بے آواز نہیں رہ پاتا۔ ذہن کے خلاؤں میں ایک وسیع دنیا، اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ روشن ہو جاتی ہے۔ اگر وہ عام سطحی ذہنیت رکھتا ہے تو تصورات میں ابھرتے ماضی کے نقوش چند لمحوں بعد اس کے شعور سے فنا ہو جاتے ہیں، مگر ایک حساس اور بیدار ذہن ان نقوش کو یونہی فنا ہونے نہیں دیتا۔ ان سے آگہی پاتا ہے۔ قلم کی جنبش سے ان نقوش کو زندگی کی حساس کیفیات کی شاخ پر گل تازہ کی مانند کھلاتا جاتا ہے۔ تہہ بہ تہہ لفظیات کی عملی سرگوشیاں بھی ہوتی ہیں ان پھولوں میں اور احساس و جذبات کا ایمائی اظہار بھی۔ ان میں انفرادی خموشیاں بھی گونجتی ہیں اور حیات کو کائنات سے مربوط کرتے تیز طرار لمحوں کی بصیرت آمیز ترتیب بھی۔

آدمی اپنے اندر پوشیدہ برہنہ حقائق کو دھوپ کی تمازت میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اظہارِ مطالب وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ چوں کہ تیز تر روشنی کو قدرے فاصلے سے دیکھنا ہی بصارت کے لیے مفید ہوتا ہے، لیکن ایک سچا

فنکار جب تخلیق کو عزم کی جہت عطا کرتا ہے تو وہ ایک Activist ہوتا ہے۔ ادب اور عملی زندگی کا فعال رکن۔ وہ زندگی کی بیزار کن ساعتوں کو بھی آنکھوں کی شہادت سے دیکھتا اور جمالیاتی بصیرت سے پرکھتا ہے تب یہ ایک مدبرانہ تحریر عمل میں آتی ہے۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی ۲۵۶ صفحات پر مشتمل کتاب کا عنوان ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب بھوپال کے ان معدودے چند اصحاب جمیل میں سے ایک ہیں (بلکہ کہا جائے کہ منفرد شخصیت اور حیثیت کے مالک) جنھوں نے اردو اور صرف اردو کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھا بھی ہے، بنایا بھی ہے۔ فرض اول کی طرح ادا بھی کیا اور تحریر و تقریر سے تلقین و تبلیغ بھی کی ہے۔ میں قوی صاحب کا کبھی شاگرد نہیں رہا۔ نہ میں نے ان سے کبھی پڑھا۔ لیکن میں نے ہمیشہ ان کا احترام ان کی تکریم ایک استاد کی مانند کی ہے۔ چوں کہ قوی صاحب جن کے استاد رہے وہ میرے عزیز ترین ساتھی ہیں خالد محمود، اقبال مسعود، محمد نعمان، خلیق احمد صدیقی، خورشید اختر، محترمہ فرحت جہاں، غفران اعظم، فتح اللہ خاں، حسنات صدیقی، رشید اختر، ماجد حسین صدیقی، منان سلیم، شہریار مدنی اور مقصود انجم وغیرہم نے کسی نہ کسی طور قوی صاحب کی علمی مصاحبت سے اپنی شخصیت میں روشنی کو منعکس کیا۔ سیفیہ کالج نے قوی صاحب کی اردو خدمات سے شہرت کی علمی مشعلیں روشن کیں اور آج ان کے شاگرد ملک میں ہی نہیں غیر ممالک میں بھی اپنی پہچان قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اردو لائبریری کا قیام، نوائے سیفیہ اور مجلہ سیفیہ کے اجراء کا مقصد بھی اردو کے نوآموز قلم کاروں کو شعری، افسانوی اور ادب کے دیگر اصناف سے رشتہ استوار کرنے کے وقیع مواقع فراہم کرنا تھا۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' قوی صاحب کی سفری زندگی (بلکہ ادبی زندگی) کی وہ داستان ہے جس کے کئی پڑاؤ ہیں اور ہر پڑاؤ میں اردو ادب کی قدآور شخصیات بھی وابستہ رہیں اور عام مسافروں کا ساتھ بھی میسر آیا۔ قوی صاحب نے پُر خلوص ان یادوں، تجربات اور احساسات کو سمیٹا ہے کہ پڑھتے وقت قاری ان شخصیات سے بھی واقف ہوجاتا ہے، جنھوں نے اردو کو اپنے خون کی ایک ایک بوند سے سینچا ہے جو پاسبان بھی ہیں اور معمار بھی۔ چند اہم نام ملا سجاد حسین (بانی سیفیہ کالج)، ملا فخرالدین، مالک رام، پروفیسر

محمد مجیب، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، آنند نرائن ملا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ خدمت گار ہیں جنھوں نے اردو ادب کو ذوق جمال کی شدت بھی دی اور تخلیقی مزاج سے لفظوں کی پیکریت بھی عطا کی۔ اس کتاب میں بھوپال کے شعروادب اور ایوانِ علم کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے اور علم وسخن کے علمبردار اصحاب کا اجمالی تذکرہ بھی ہے۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' عبدالقوی صاحب دسنوی کی اردو خدمت کا عکس مکمل ہے۔ اردو نثر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ شعری تخلیقات کی تیز رو ہواؤں میں یہ آمد خوشبو کے جزیرے آباد کرتی ہے۔ اس دورِ عجیب میں جب اردو کو ہم اردو داں ہی، اپنی تحریر میں، اپنی تقریر میں اور بیان میں، اپنے نصابِ تعلیم میں اور اپنی روزمرہ کی گفتگو میں قتل کرنے پر آمادہ ہیں اس کتاب کی قیمت ''اردو کی خدمت'' مقرر کرنا اردو کے مردِ مجاہد ہی کا عزم ہوسکتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں جہاں اردو کتابوں کی قیمت اسٹرلنگ پونڈ اور یو ایس ڈالر میں مقرر کی جاتی ہے بھوپال جیسے شہر سے ایسی ضخیم کتاب کی قیمت ایسی مقرر کرنا ایک نادر مثال ہے، جس کی پذیرائی ہمارا فرض ہے۔

ہر باذوق شخص سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو نہ صرف حاصل کرے بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں اس کا تذکرہ بھی اس طرح کرے کہ اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوسکے۔

(۳)

دشتِ ادب کے سیاح جناب عبدالقوی دسنوی کے ''بمبئی سے بھوپال تک'' سفر پر ایک تاثر ـــــ کوثر صدیقی

سفر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ آدم نے سب سے پہلا سفر کیا ایک عظیم مقصد کے تحت۔ جنت سے نکل کر دنیائے آب وگل کو جنت نشاں بنانے کا مقصد۔ سفر ایک تحریک ہے، جو انسان اور اس کی زندگی کو متحرک رکھتی ہے۔ سفر سے انسان فعال رہتا ہے۔ ہر سفر کی ایک منزل ہوتی ہے جہاں پہنچنے کے لیے مسافر کو راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پڑاؤ کرنا پڑتے ہیں۔ تازہ ہوکر آگے بڑھنے کا حوصلہ جٹانا پڑتا ہے۔ سفر اچھے مقصد سے ہو اور مسافر حوصلہ مند ہو تو سفر سفر نہیں رہتا۔ راہِ طلب کی آبلہ پائی

راحت بن جاتی ہے۔ ایک ایسے ہی اچھے مقصد سے کیے گئے سفر کی داستان ہے جناب عبدالقوی دسنوی (قوی صاحب) کی تازہ کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک''۔

قوی صاحب کے والد پروفیسر سید سعید رضا مرحوم بمبئی کی معروف درسگاہ سینٹ زیویرس کالج میں معلم تھے۔ ان کا وطن بہار کا مشہور قصبہ دسنہ تھا جو ایک چھوٹی سی جگہ ہونے کے باوجود علم وادب کا گہوارہ تھا جس نے علامہ سید سلیمان ندوی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کو پیدا کیا۔ اسی مدینۂ علوم وادب میں قوی صاحب کی پیدائش ہوئی۔ علم وادب کا ذوق قوی صاحب کو اپنے والد محترم سے ورثے میں ملا ہی تھا دسنہ کے ماحول نے اس کے حفظ و بقا اور ارتقا کے لیے مزید تقویت بخشی۔ قوی صاحب کی زندگی اور ادبی سفر کا آغاز اسی مردم خیز زمین سے ہوا۔ ان کے سفر کا پہلا پڑاؤ بمبئی میں ہوا جہاں آگے چلنے کے لیے انھوں نے دم لیا۔ بمبئی پہنچنے سے بہت پہلے لڑکپن میں ہی جب وہ دسنہ میں زیر تعلیم تھے، قوی صاحب کا قلم کاغذ سے رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ بمبئی کے اور بالخصوص سینٹ زیورس کالج کے ادبی ماحول نے ان کے ذوق کو مزید ابھارا۔ کم عمر میں ہی بڑی عمر کے اہلِ قلم حضرات کی طرح لکھنے کا سلیقہ حاصل کر لیا۔ والد کے زیر سایہ تعلیم وتربیت کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ بڑے بھائی محی رضا سے آسمانِ علم وادب میں پرواز کرنے کے آداب سیکھے۔ تعلیم کی تکمیل اور قلم پر مضبوط گرفت نے ان کے پروں میں وہ طاقت اور خود اعتمادی پیدا کر دی جو آسمان کی بلندیوں کو تسخیر کرنے کے لیے دل میں جوش اور ولولہ عطا کرتی ہے۔ زندگی کے ساتھ علم وادب کی مہمات سر کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پرواز کا رُخ بمبئی سے بھوپال کی جانب کیا۔ دورانِ پرواز نئی منزل اور نئے ماحول کی اجنبیت کی فکر کے ساتھ نئے کیریر کے آغاز کی خوشی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ بھوپال کی سرزمین پر ۱۹ر فروری ۱۹۶۱ء کو پہلا قدم رکھا اور سیفیہ کالج بھوپال سے بطور معلم وابستگی اختیار کر لی۔ اپنے حسنِ اخلاق اور پرکشش شخصیت کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد ہی نئے ماحول کی اجنبیت کو اپنائیت میں تبدیل کر لیا۔ یہاں کی آب وہوا اور ماحول میں خود کو ضم کر دیا۔ بھوپال کو وطنِ ثانی بنا لیا۔ اپنے وطن کی طرح یہاں کے لوگوں سے میل جول، ملاپ، محبت اور تعلقات کی مضبوط بنیاد پر رشتوں کو مستحکم کیا۔ آخر کار قوی صاحب سے بھوپال اور بھوپال سے قوی صاحب اس طرح

بغل گیر ہوئے کہ من تو شدم تو من شدی کے مصداق جدا نہ ہونے والی ایک اکائی بنگئے۔
اس کے بعد اگر چہ قوی صاحب کے سامنے زمین اور بھی آسمان اور بھی تھے مگر وہ بھوپال کے رنگ وبو سے مسحور ہو کر اسی چمن کی شاخِ گل پر چار تنکے رکھ کے یہیں کے ہو رہے۔
کتاب کے عنوان ''بمبئی سے بھوپال تک'' سے ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ عام سفر ناموں کی طرح ایک سفر نامہ ہوگا جس میں بمبئی سے بھوپال تک کی مسافت کے کھٹے میٹھے تجربات اور واقعات وغیرہ کا ذکر ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے اس میں بھوپال تک کے سفر کا ذکر بطور تمہید ہے اور ''بھوپال میں'' (یعنی قیامِ بھوپال) کا بیان ہی اصل موضوع ہے۔
دنیا میں ہر شخص کے مزاج کی ساخت الگ ہوتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ زاویۂ نگاہ بھی علیحدہ ہوتا ہے۔ قوی صاحب بھوپال میں کالج کے معلم کی حیثیت سے آئے تھے، دیگر معلموں کی طرح وہ بھی درس وتدریس کے فرائض روایتی انداز میں ادا کر کے سکون سے زندگی گزارنے پر اکتفا کر سکتے تھے لیکن ان کے مزاج میں تحقیق وتخلیق کا ایسا کرب تھا جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ ان کا ذہن ہمہ وقت نوکِ قلم کو متحرک رکھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوی صاحب کے حالات یا تلاشِ معاش نے مجبوراً معلم نہیں بنایا تھا بلکہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے ابتدا ہی سے گزرِ معاش کے لیے معلّمی کا پیشہ اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس سے تخلیقی ادب میں مدد ملتی ہے۔ آغاز سے ہی ان کا نصب العین اردو کی خدمت کرنا اور نظر سے اوجھل تحقیق طلب گوشوں کو تلاش کرتے رہنے کا تھا۔ بھوپال آکر بہت جلد ان کی پارکھی نظروں نے دیکھ لیا کہ یہ شہر بہت بڑی کانِ علم وادب ہے اور اقبال، غالب، آزاد اور کئی مشاہیر کے یہاں کی زمین میں دفن جواہرات کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ زمین میں دفن اس دفینے کا علم بھوپال کے اکثر اہلِ علم حضرات کو پہلے سے تھا مگر کسی نے کھودنے اور منظرِ عام پر لا کر ادبی دنیا کے سپرد کرنے کی نہ پہل کی تھی نہ زحمت۔ یہ سعادت خدا نے قوی صاحب کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ قوی صاحب کی شخصیت میں ایسی جاذبیت اور وزن ہے جو ہر شخص کو متوجہ کرتی ہے۔ ان کا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ وہ جس سے جو بات بھی کہتے ہیں وہ اسے بغور سنتا ہے، سمجھتا ہے اور قبول کر لیتا ہے۔
سیفیہ کالج کے کرتا دھرتا مرحوم فخرو بھائی تھے۔ کالج کے شعبۂ اردو کو مثالی شعبہ بنانے کے

قوی صاحب نے مہنگی سستی جیسی تجویزیں بھی ان کے سامنے رکھیں، انھوں نے بخوشی قبول کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر عرصے میں کالج کی شعبۂ اردو کی اپنی خود کی عظیم لائبریری وجود میں آگئی۔ اردو کی پوسٹ گریجویٹ کلاسیز بھی شروع ہو گئیں۔ پہلے کالج کا سالانہ میگزین انگریزی، ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں مشترکہ طور پر شائع ہوتا تھا۔ قوی صاحب کی کوشش سے صرف اردو کا ایک علیحدہ میگزین آزادانہ طور پر شائع ہونے لگا۔ اس سلسلے کے تحت ایسے یادگار تاریخی مجلّے شائع ہوئے جو اردو دنیا میں اپنا ایک مقام اور شہرت رکھتے ہیں، یہاں یہ ذکر خصوصی طور پر اس لیے کیا گیا کہ سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کی خصوصی آن بان قوی صاحب کے دم سے ہی تھی۔ ان کے کالج سے ریٹائر ہوتے ہی شعبۂ اردو سے لے کر لائبریری تک ہر جگہ زوال کی سیاہ پر چھائیاں دکھائی دینے لگیں۔ خصوصی مجلّہ تو بڑی چیز ہے عام سالانہ میگزین شائع ہونا بھی بند ہو گیا۔ طلباء کے ساتھ اساتذہ کی تعداد بھی دھیرے دھیرے کم ہو گئی۔ شعبۂ اردو کا وجود ہی ختم جیسا ہو گیا۔

قوی صاحب زندگی کے آخری پڑاؤ میں ہیں۔ اس عمر میں عام طور پر لوگ اپنی سوانح عمری لکھنا پسند کرتے ہیں۔ ''بمبئی سے بھوپال تک'' کو سوانحِ حیات کے خانے میں تو نہیں رکھا جا سکتا لیکن ''سوانحِ ادبی'' ضرور کہا جا سکتا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک انھوں نے دشتِ ادب میں جتنی سیاحی کی ہے، جن جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، جن خارزاروں سے ان کا گزر رہا ہے، جن حالات سے نبرد آزمائی کی ہے، ان سب کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ ''بمبئی سے بھوپال تک'' قوی صاحب کے ادبی سفر کی دستاویزی داستان ہے۔ بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات جس طرح تاریخی اہمیت کے ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو غور و فکر اور تقلید کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح ادبی نگارشات کے سوانحات بھی تحقیق و تخلیق کا ذوق رکھنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ قوی صاحب نہ روایتی قسم کے عام معلم ہیں نہ عام اہلِ قلم۔ ہر نقطۂ نظر سے وہ غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی معلمی کلاس روم تک محدود نہیں۔ انھیں ہر وقت اپنے طلبا کی مستقبل سازی کی فکر ستاتی رہتی ہے۔ سابق طالب علم ہو یا کوئی موجودہ طالب علم وہ سب کی خیر خبر اس کی ادبی نگارشات کے حوالے سے لیتے رہتے ہیں۔ ہمہ وقت ان

کی رہبری اور مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ ہر طالب علم سے امید کرتے ہیں کہ معاشی میدان میں نمایاں کامیابی اور کارکردگی کے ساتھ وہ ایک اچھا صاحب قلم بھی بنے۔ اچھا شہری بنے۔ محبّ وطن بنے۔ اردو کی خدمت کرے۔ وہ سب کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب و تاکید کے ساتھ اپنی فطرت سے مدد کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ ''بمبئی سے بھوپال تک'' میں ایسے تمام واقعات کا ذکر ہے جو قاری کو قلم کش بننے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ باعمل صاحبِ کردار شخصیت کی تشکیل میں بھرپور مدد کرتے ہیں۔ ایک لائق اور Dedicated استاد کے دل میں طلبا کے لیے جو درد ہوتا ہے وہ ان کے ان وداعی خطبوں میں جھلکتا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً طلبا کو تکمیل تعلیم کے بعد رخصت ہوتے وقت دیے ہیں۔ ان کے یہ ناصحانہ خطبے تمام طلباء کے لیے زندگی کے سنگھرش میں یکساں طور پر مفید اور مشعلِ راہ ہیں۔

قوی صاحب ایک لائق اور فائق استاد کے علاوہ ایک مفکر، دانشور، محقق، مصنف اور مولف بھی ہیں۔ اقبال اور بھوپال، غالب اور بھوپال اور مولانا آزاد پر انھوں نے جو کام کیا ہے وہ Original thought & work کے ذیل میں آتا ہے۔ دوسرے قلمکاروں نے مذکورہ موضوعات پر جو کام کیا ہے اس کی بنیاد قوی صاحب کی نگارشات پر ہے۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ سے قوی صاحب کا کردار واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ اپنے اساتذہ، بزرگوں اور محسنوں کا نام ادب واحترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ ہر شخص کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں کردار سازی ہی آتی ہے کردار کشی کرتے ہوئے کہیں نظر نہیں آتے۔ سیکولر ذہن اور صاف ستھرے مزاج کے مالک ہیں۔ محبّ وطن ہیں حبِ وطن کی تعلیم دیتے ہیں۔ فرقہ پرستی سے نفرت کرتے ہیں اور فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کی تلقین کرتے ہیں۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' ایک ایسی ادبی دستاویز ہے جس سے قوی صاحب کی ادبی زندگی کی تمام تر کارگزاریوں سے قاری واقف ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب عام قاری کے علاوہ اہلِ قلم حضرات کے لیے بھی خاصے کی چیز ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہر اہلِ قلم کی خواہش ہوگی کہ وہ بھی اپنی ادبی زندگی کی داستان ایسے ہی مرصع اور منضبط انداز میں لکھ کر اپنی نسل کو

سپرد کر سکے۔ قوی صاحب کی اردو خدمت کے جذبے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی قیمت نقد سکۂ رائج الوقت مقرر نہ کرتے ہوئے ''اردو کی خدمت'' متعین کی ہے۔ دعا ہے کہ قوی صاحب کی عمر دراز ہو۔ قلم شگفتہ اور متحرک رہے۔ وہ اردو کی خدمت کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی اردو کی خدمت کے لیے تلقین Motivate کرتے رہیں۔

کوثر صدیقی
۶ر جون ۲۰۰۴ء

(۴)

روزنامہ ''اردو ایکشن'' (۲۰ر جون ۲۰۰۴ء)

تبصرہ نگار: نجمہ بیگم

ترتیب:

باب اول : دسنہ، بمبئی اور بھوپال

''بمبئی سے بھوپال کا سفر'' سینٹ زیویرس کالج، بمبئی، انجمن اسلام واحمد سیلر اسکول، سید شہاب الدین دسنوی، باقر مہدی، جشن شاعر، تاج بھوپالی، ملا فخر الدین، پروفیسر مرتضٰی علی شاد، راجندر سنگھ بیدی، سیفیہ کالج، پرنسپل حمید قریشی، جہاں قدر چغتائی، پروفیسر مظفر حنفی، بزمِ ادب، مجلّہ سیفیہ، ڈاکٹر گیان چند جین، کاروانِ ادب بمبئی، ایک اور مشرقی کتب خانہ، بشیر الحق دسنوی، سید عبدالحکیم رحمانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خط، پروفیسر سید سعید رضا، پروفیسر عبدالحی رضا، جشن طلائی جوبلی الاصلاح لائبریری دسنہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، حسرت کی سیاسی زندگی اور سردار جعفری، کیفی اعظمی سے ملاقات، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر شنکر دیال شرما، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور کے پیغامات، نگاہ اولین (مجلّہ سیفیہ) دسنہ کا ماحول، ظفر آزاد، بمبئی کی تعلیم، ڈاکٹر حنیف نقوی اور ہندوستان جاگ اٹھا سیفیہ کالج کے اردو طلبا، اہلِ بھوپال، ''گیا شہر'' میں چوری کا وقعہ (ریل کے سفر کا ایک واقعہ)، درگا پرشاد شاد، مولانا محوی صدیقی، تخلص بھوپالی، نوائے سیفیہ، شاکر علی خاں، نواب حمید اللہ خاں کا عجیب واقعہ، علامہ اقبال بھوپال میں،

بشیر احمد ڈار، صہبا لکھنوی، ماسٹر اختر، بزم فنکار بمبئی اور یوم پنڈت دتاتریہ کیفی، غالبیات، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، غالب اور بھوپال، غالب صدی تقریبات، نسخہ بھوپال ثانی، قاری شفیق الحسن، توفیق احمد، محمد طفیل، قادر نامہ غالب، دلارے آرٹسٹ اور محمد نسیم، خورشید اختر، سید مظہر علی، شعبہ اردو اور سیفیہ کے طلبا، راجندر سنگھ بیدی، مولانا محمد عمران خاں اور تاج المساجد، بزم سلیمان، ملا سجاد حسین کا انتقال، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، علامہ شبلی نعمانی، ملازمت سے سبکدوشی،، بحیثیت سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی، اکادمی کی مجلس عاملہ کی نشست (۱۲ر اکتوبر ۱۹۹۱ء)، اکادمی کی مجلس عاملہ کی نشست (۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۱ء)، سمینار "مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب" (یکم فروری و ۲ر فروری ۱۹۹۲ء)

باب دوم : چند تحریریں

میں کیوں لکھتا ہوں، کچھ اقبال، دار الاقبال بھوپال اور سیفیہ کالج کے بارے میں، سیفیہ کالج کے عزیز طلبا اور میں، ایک یادگار سپاسنامہ (فیض احمد فیض کی خدمت میں، استقبالیہ (مندوبین بزم سلیمان اور معززین شہر کے روبرو) "اردو زبان و ادب، سیفیہ کالج اور بھوپال"، ایک تقریر، جانے والے کی یاد آتی ہے (ملا سجاد حسین مرحوم)، تم سلامت رہو ہزار برس (فخر الدین صاحب کی صحت یابی پر)، تسبیح روز و شب، قصہ ایوان ملا رموزی، بھوپالیات کے جائزے، شیش محل کو یادگار اقبال کی صورت میں اقبال لائبریری کے حوالے کیا جائے (ایک خط بنام حافظ ماجد حسین مدیر روزنامہ اردو ایکشن، بھوپال)، دل کا بوجھ ہلکا ہوا، کاش ایسا ہو جائے (ایک اور خط حافظ ماجد حسین مدیر روزنامہ اردو ایکشن، بھوپال)، اتحاد پیدا کریں یہ گھڑی محشر کی ہے (ایک خط بنام نعیم کوثر مدیر صدائے اردو، بھوپال)، آہ برادر محترم پروفیسر سید عبدالحی رضا مرحوم۔

درج بالا موضوعات پر مبنی شائع کتاب کے مصنف

اقبال، ابوالکلام آزاد اور بھوپال ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اول الذکر تینوں موضوعات میں ان کا شمار ماہرین میں ہوتا ہے اور جہاں تک سوال بھوپال سے متعلق اور

مشاہیر سے اس کے تعلق کا ہے ان میں اقبال، غالب، ابوالکلام آزاد، شبلی، سرراس مسعود، جگر، سید سلیمان ندوی اور عبدالرزاق کانپوری پر سب سے پہلے توجہ صرف کر کے انھوں نے نہ صرف بھوپال کے ادبی وقار کو بلند کیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وطنِ مالوف بھوپال نہ ہوکر بھی، بھوپال پر ان کا کام سب سے زیادہ ہے۔

تحقیق و تنقید و اشاریہ سازی ان کا خاص میدان ہے۔ جس کے تحت غالبیات پر چار، اقبالیات پر سات، ابوالکلام سے متعلق دس، بھوپال سے متعلق چار کتابیں، مہدی افادی، حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی پر ایک ایک کتاب اور سات اشاریوں کے علاوہ مرتب کردہ کتابوں میں اور ہندوستان جاگ آٹھا، نذرِ سجاد، نذرِ تخلص، غالب نمبر (مجلّہ سیفیہ) یادگارِ اقبال (مجلّہ سیفیہ) تین بھوپال نمبر (نوائے سیفیہ) ارمغانِ سیفیہ جواہرِ آزاد، مکاتبِ عبدالحق بنام محوی صدیقی اور فخر نامہ مختلف اشاعتی اداروں مثلاً مکتبہ جامعہ (دہلی)، نسیم بک ڈپو (لکھنؤ)، ساہتیہ اکادمی (دہلی)، گلوب پبلشر (لاہور)، اقبال اکادمی (لاہور)، شعبہ اردو سیفیہ کالج، یوپی، بہار، مہاراشٹر اردو اکادمیوں کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔

دسنوی صاحب کی ادبی خدمات ہی لائقِ تحسین نہیں بلکہ بحیثیت استاد تیس سال تک عبادت کی طرح فرائضِ منصبی انجام دے کر، محدود وسائل میں انھوں نے جس طرح شعبہ اردو اور اس کتب خانے کی توسیع و ترقی نیز طلبا کی تعلیم و تربیت سے متعلق اہم اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال فی زمانہ شاذ و نادر ہی مل سکے گی۔

دسنوی صاحب کا تعلق اعلیٰ تعلیمی، ادبی خانوادے سے ہے جو صحت مند تہذیبی اقدار اور اعلیٰ ادبی ماحول انھیں ورثے میں ملا اس سے انھوں نے اپنی شخصیت کی تعمیر کی اور شاگردوں کو انھیں اوصافِ حمیدہ سے متصف کرنے کی سعی کرتے رہے۔ عام اساتذہ کرام کی مانند فرائضِ منصبی کے دائرے کو درجات میں محض درس و تدریس کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ طلبا کی ذہنی، فکری، تخلیقی، علمی، ادبی اور تہذیبی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی خاطر بی۔ اے درجات کی سطح پر "انجمن اردو" ایم۔ اے کی سطح پر "بزمِ اردوئے معلیٰ" اور فارغ التحصیل طلباء کے لیے "کاروانِ سیفیہ" کی تشکیل کر کے طلبا

کو فعال بنانے اور اردو تدریس کو تہذیبی مرقع میں سجانے کی کوشش کی۔ ریسرچ اسکالرس کے استفادے کے لیے کالج مینجمنٹ کے تعاون سے کتب خانہ شعبۂ اردو کو دس ہزار قیمتی کتابوں، رسالوں، مخطوطات اور شعرا کی تصاویر سے مزین کر کے تحقیقی کتب خانہ کی شکل عطا کی۔ گوشۂ غالب، گوشۂ اقبال، گوشۂ ابوالکلام، گوشۂ لغات، گوشۂ بھوپال، گوشۂ سیفیہ قائم کیے جن میں موضوع سے متعلق تقریباً تمام اہم کتب اور رسائل محفوظ ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' (کچھ یادوں، کچھ تجربات، کچھ ردِ عمل) عبدالقوی دسنوی صاحب کی زندگی کی ایک یادگار داستان ہے جو آج کی نسل کے لیے بطور خاص ادبی حلقوں کے استفادہ کے لیے بہت کارآمد ہے۔

محترم قوی صاحب نے بے حد خلوص سے ان یادوں کی تجربات اور احساسات کو سمیٹا ہے کہ پڑھتے وقت قاری ان شخصیات سے بھی واقف ہو جاتا ہے جنھوں نے اردو کو اپنے خون کی ایک ایک بوند سے سینچا ہے، جو پاسبان بھی ہیں اور معمار بھی۔ اس کتاب میں بھوپال کے شعروادب اور ایوانِ علم کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے اور علم و سخن کے علم بردار حضرات کا اجمالی تذکرہ بھی۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' عبدالقوی دسنوی صاحب کی اردو خدمت کا عکس مکمل ہے۔ اردو نثر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ شعری تخلیقات کے تیز رو ہواؤں میں یہ آمد خوشبو کے جزیرے آباد کرتی ہے۔ اس دورِ عجیب میں جب اردو کو ہم اردو داں ہی اپنی تحریر میں، اپنی تقریر میں اور اپنے بیان میں، اپنے نصابِ تعلیم میں اور اپنی روز مرہ کی گفتگو میں قتل کرنے پر آمادہ ہیں اس کتاب کی قیمت ''اردو کی خدمت'' مقرر کرنا اردو کے مردِ مجاہد کا عزم ہو سکتا ہے۔

''بھوپال سے بمبئی تک'' کتاب میں شائع کچھ مواد کے اقتباسات قارئین کی نذر ہیں:

قوی دسنوی صاحب کے جذبات خود ان کے الفاظ میں:

> '' یہ چند اوراق بیتے دنوں کی یادوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھیں لکھتے وقت بھی خوشی ہوئی، کبھی جوش و خروش پیدا ہوا اور حوصلہ بڑھا کبھی تلخ حقائق نے

غمزدہ کردیا، لیکن حوصلہ شکن حالات میں کبھی اپنے رب کی رحمتوں اور نعمتوں سے مایوس نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ اس کا منتظر رہا''۔

''میں آدمیت اور احترام آدمی'' پر شروع سے نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اسے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھتا رہا ہوں۔ میں دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہوں، دوسروں کی ترقی پر مسرور ہوتا ہوں، دوسروں کی تکلیف سے لرز اٹھتا ہوں''۔

''میری تربیت ایسے ہاتھوں میں ہوئی ہے جو دنیا کی فلاح چاہتے تھے جن کو تعمیر سے دلچسپی تھی، جو امن وامان کی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ انسانوں کے ساتھ محبت کو زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اور دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے''۔

''میں ہر اُس شخص سے دل سے قدرداں ہوں جس نے ملک وقوم کی خدمت کی یا خدمت کرنے میں مصروف ہے وہ لوگ جو انسانوں سے نفرت پیدا کرتے ہیں انسانوں کے درمیان حیوانیت کے جذبات جگاتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ان کے تصور سے میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ ننگ انسانیت ہیں۔

ایسی صورت میں جب ہم اس قدر خود غرض، بے حس، حاسد اور تنگ نظر ہوگئے ہیں کہ صرف اپنی کرسی، اپنے انعام، اپنے ذاتی مفاد، اپنی شہرت اور اپنی عزت کا ہمیں خیال رہتا ہے اسی میں خوش رہتے ہیں، ایسی حالت میں آیئے ہم سب مل کر کوشش کریں کہ:

☆ ہمارے سوچنے کا انداز صحت مند ہو جائے
☆ ہم حق کے طرفدار رہیں۔
☆ ہم ایک دوسرے کے ہمدرد بن جائیں۔
☆ ہم دوسروں کی ترقی کو اپنی ترقی بھی سمجھیں۔
☆ ہمارا ہر گھر اردو کے نغموں سے گونج اٹھے۔
☆ ہمارا ہر فرد محب اردو، محب شہر، محب ہندوستان ہو۔

☆ ہم حسد اور تعصب کی بیماری سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

☆ ہم انسانوں کے درمیان مساوات کو عام کریں اور آدمیت کے احترام پر یقین رکھیں، اور ہر فرد کے دل میں یہ بات اتار دیں:

جہادِ زندگانی میں محبت فاتحِ عالم

ہم میں ہر فرد اگر صحت مند انداز سے ان پر غور و فکر کرنا شروع کردے گا اور عمل کرتا رہے گا تو یقین جانیے ساری برائیاں اور خرابیاں خود بخود دور ہوتی چلی جائیں گی اور ہمارا شہر، ہمارا صوبہ، ہمارا ملک جنت نظیر بن جائے گا"۔

بھوپال کی عظمت کے بارے میں:

اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کا بھوپال کی عظمت کے بارے میں خیالات کا اس طرح اظہار ملتا ہے:

"یہ کسی نے صحیح طور پر کہا ہے کہ بھوپال آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوتا"۔

اور مولانا عبدالماجد دریابادی آئے تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

"بھوپال مرحوم کی خدمات اردو کا تو کہنا ہی کیا لیکن بھوپال موجودہ بھی پکار اٹھے:

میرا لہو بھی خوب ہے تری حنا کے بعد

تو کچھ ایسا بے جا نہ ہوگا"۔

اور کیفی اعظمی کے قلم سے بے ساختہ نکلا:

"ہماری تہذیب اور زبان کے جتنے پرانے مرکز تھے وہ سب کے سب قریب قریب آثارِ قدیمہ ہو چکے ہیں جن کو آج ہم اپنے شاندار ماضی کے ایک مقبرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں لیکن صرف بھوپال کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے اور یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ ہمارا مرکز تھا اور ہے یہاں اگر کچھ سورج ڈوبے ہیں تو کچھ طلوع بھی ہوئے ہیں جن سے ہماری

تہذیب اور زبان آج بھی کسب نور کر رہی ہے"۔

کتاب میں شائع کچھ درج بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خالص اردو زبان و ادب کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دینے والے پروفیسر قوی دسنوی صاحب کی سفری داستان عوام الناس خصوصاً اردو داں حلقوں کے لیے کتنی دلچسپ اور لطیف ہو سکتی ہے لیکن حقیقتاً اس کا لطف پوری کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور محترم پروفیسر قوی دسنوی صاحب کی محنت کا صلہ بھی اور وہ بھی بلا کسی معاوضہ کے۔

(۵)

بمبئی سے بھوپال تک

مصنف: عبدالقوی دسنوی— مبصر: ڈاکٹر دیوان حنان خاں

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

معروف ادیب پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے اگرچہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا، لیکن ان کے مضامین اور کتب کے مطالعے سے ان کے مزاج نیز افکار و خیالات کو سمجھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اردو کی بے لوث خدمت انجام دینے والے اس سے سچی محبت کرنے والے مجاہدین اردو اگرچہ کم ہیں لیکن اردو زبان و ادب کا بھرم انھیں سے قائم ہے اور دسنوی صاحب کا شمار انھیں میں کیا جائے گا۔

دسنوی صاحب کی کتاب "بمبئی سے بھوپال تک" دو ابواب میں منقسم، ماضی کی یادوں پر مشتمل ہے۔ بہار کا مردم خیز گاؤں دیسنہ، دسنوی صاحب کا وطن ہے جہاں ان کا بچپن گزرا۔ بمبئی میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہاں کے علمی ادبی ماحول میں رہ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ بھوپال ان کا میدانِ عمل ہے۔ جہاں وہ گزشتہ ۴۳ برسوں سے مقیم رہ کر زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب کے باب اول میں دیسنہ، بمبئی اور بھوپال کے شب و روز کی روداد کو دلچسپ افسانوی انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ نجی روداد رودادِ جہاں بن گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے تینوں مقامات سے متعلق کئی اہم شخصیات، واقعات اور علمی ادبی اداروں اور ان کی کارکردگی کا علم ہوتا ہے۔ کئی سچائیاں بے نقاب ہوتی نظر آتی ہیں۔ کئی مشاہیر کے چہرے چمکتے دمکتے نظر آتے

ہیں۔ پُرلطف اندازِ بیان نے بے شمار قصہ ہائے پارینہ کو گویا زبان عطا کردی ہے کہ ہر لمحہ بولتا اور ہر عکس ڈولتا نظر آتا ہے۔

کتاب کا باب دوم دسنوی صاحب کی پندرہ فکر انگیز تحریروں پر مشتمل ہے۔ جن کے مطالعے سے دسنوی صاحب کے افکار و نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔

''بمبئی سے بھوپال تک'' ایک دلچسپ کتاب ہے جو توجہ سے پڑھی جائے گی اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(۶)

بمبئی سے بھوپال تک

(کچھ یادیں، کچھ تجربات، کچھ ردِ عمل)

از فرحت جہاں (بھوپال)

پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' (۱۵؍ جولائی ۲۰۰۴ء)

کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ بغیر قیمت ادا کیے کتاب آپ کی ہوگئی ہو؟ ''بمبئی سے بھوپال تک'' ایک منفرد پیشکش ہے جو پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اردو سے محبت کرنے والوں اور طالب علموں کو دی ہے۔ قیمت کے خانے میں ''اردو کی خدمت'' درج ہے۔ قیمت کی ادائیگی کا انھیں انتظار ہے۔ ادھار کا کھاتہ بھی انھوں نے نہیں کھولا۔ قارئین کے لیے یہی بات پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ انھیں آج کا کام کل پر چھوڑنے کی عادت ہے۔ ادھر قیمت کی ادائیگی کا بوجھ سر پر اور دوسری طرف راہِ فرار اختیار کرنے کی ترکیبیں تلاش کی جارہی ہیں، لمحہ لمحہ مادیت کی طرف بڑھتے قدموں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اردو زبان کے سوکھتے پیڑ پر ایک نظر ڈالیں اور سوچ کی اس گرہ کو کھولیں کہ نشو و نما ہونے کے بجائے ڈالیاں کیوں سوکھ رہی ہیں۔ اگر پیڑ زمین بوس ہوگیا تو ہماری تہذیب و ثقافت کا سایہ سر سے اٹھ جائے گا اور وقت کی تمازت ہماری وراثت کا اعلیٰ معیار اور اعلیٰ فراستوں کا قطرہ قطرہ نچوڑ لے گی اور جب علمی خزانہ خالی ہوجاتا ہے تو قومیں ذلیل و خوار ہوجایا کرتی ہیں۔ لیکن قوی صاحب اردو کی خدمت کو ٹالنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ دماغ کی گپھا میں پیچھے کی طرف سے باہر نکلنے کا جو ایک چور دروازہ ہوتا ہے، جو اسباب و علل کے بے

تعلق جیل وجحت سے بے نیاز اپنے خیال کو راہ فرار اختیار کرنے میں مدد کرتا ہے اردو زبان بولنے والے اس راستہ سے کہیں نہ نکل جائیں۔ قوی صاحب راستہ میں کھڑے حائل ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اردو ادب کے پروفیسر رہے ہیں، ذہنی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اردو زبان کے فروغ اس کی ڈوبتی اور ابھرتی سانسوں اور ان کی بقا کے لیے مقدور بھر کوشش میں لگے رہے ہیں۔ ذہنی زرخیزی کی وجہ سے کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تحقیق اور تنقید میں ڈوب کر زندگی گزاری، تہہ تہہ معنی و جواز تلاش کیے، ہجری اور سنہ عیسوی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح نکالا جیسے غوطہ زن موتی اور نایاب پتھروں کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ مشاہیر کی سیاسی اور ادبی زندگیوں پر خامہ فرسائی اس لیے کی کہ اسی علمی خزانہ سے زمانہ اس درخشندگی اور تابناکیوں، حرف حرف نکتہ سنجیوں سے محروم نہ رہ جائے۔ خدمت زبان کو خدمت خلق کی طرح فرض اولیں سمجھا، اجر وثواب کا حساب انگلیوں پہ نہ رکھا، کاتب وقت اردو کی کسمپرسی اور زبوں حالی تحریر کر رہا ہے۔ یہی کاتب ماضی میں اردو کے عروج اور ہر دلعزیزی، سنہری حروف میں لکھ چکا ہے۔ لیکن قوی صاحب آج کی بات کرنا چاہتے ہیں۔ "بمبئی سے بھوپال تک" یہ کوئی ریل کا سفر تو ہے نہیں کہ کلہڑ میں چائے پینے اور گرم گرم مونگ پھلیاں کھانے اور باہر کے قدرتی نظاروں سے محظوظ ہونے میں گزرا ہو۔ اس سفر میں شامل ہیں یادوں کی خوشبو، تجربات کی تلخی اور ردِ عمل کا اتار چڑھاؤ۔ ریل گاڑی جس طرح مختلف راستوں کے پیچ وخم سے گزر کر منزل کی طرف بڑھتی جاتی ہے قوی صاحب کا ذہنی سفر بھی خوشگوار یادوں، تلخیوں کی ڈھلانوں اور امید کی جگمگاتی کرنوں کو دیکھنے میں گزرا ہے۔

"بمبئی سے بھوپال تک" کے سفر میں جگہ جگہ رک رک کر اور ٹھہر کر کئی اہم واقعات اور ان سے جڑے لوگ ان کو ملتے ہیں۔ پُر خلوص، ہمدرد رفیق اور غمگسار بھی ملے تو وہیں جھگڑالو، غیر معتبر حسد ورشک میں جھلتے لوگوں سے بھی واسطہ پڑا۔ جس کی وجہ سے کڑوی، کسیلی حقیقتوں کے گھونٹ پینا پڑے۔ آپسی تعلقات پر ضربیں لگیں لیکن شہادت و تجربات کی روشنی میں واردات قلب پر جو گزری، سو گزری دلِ رنجور کو سمجھایا، بجھایا اور غم کے اظہار کو پھیلا کر بیان کرنے سے انھوں نے ہمیشہ اجتناب برتا۔

انسانی قدروں کی شکست وریخت تو ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے اس کا شکوہ کیا۔ بندہ مقتضائے طبیعت پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ لیکن موجودہ زمانے نے اقدار کی بساط یک لخت اسی طرح الٹ دی ہے کہ منتشر زیادہ ہوگیا اور باقی بہت کم رہ گیا۔ قوی دسنوی صاحب کا آبگینہ بھی چور چور ہوتا رہا ہے لیکن دل کے دامن کو میلا ہونے سے بچانے کی بہت کوشش کرتے رہے کہ سفیدی نہ رہی تو کچھ بھی نہ رہا۔ ناموافق حالات میں بھی دل برداشتہ ہونا انھوں نے نہیں سیکھا تھا۔ آدمیت احترام آدمی پر یقین اس لیے کرتے ہیں کہ والدین نے شرافت، سچائی اور فرض شناسی کا سبق سکھایا تھا جو قدم قدم ساتھ چلتا رہا اور تپش کو سایہ میں بدلتا رہا۔

بہار کے قصبہ دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ذہن پر اساتذہ کی سچائی، شفقت اور محنت نے ان کے شعور اور احساس کو جلا بخشنے میں اس طرح مدد کی جو آگے چل کر مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ گویا چنگاری یہاں سے لی اور چراغ کہیں اور روشن ہوا۔ وہ دل والوں کی تلاش میں نکلے، تجسس اور امید دونوں شاملِ سفر ہوئے۔ بمبئی سے اعلیٰ تعلیم سینٹ زیویرس کالج میں حاصل کی۔ محترم و عظیم شخصیتیں ملیں جن کی قربت نے انسانی رشتوں کی گہرائیوں میں اضافہ کیا اور انسان اپر بھروسہ کرنے کا درس دیا۔ بغرض ملازمت تعلیمی اداروں کی تلاش میں بھوپال آنا ہوا۔ ایک نیا اور اجنبی شہر، انجان لوگوں سے کس قسم کا سابقہ پڑے کہ دل کی اندرونی اور بیرونی دنیا میں بہت فرق ہوا کرتا ہے۔ جس کی ناپ تول آسان نہیں۔ اس سفر میں قوی صاحب کو بہت الجھن تھی، لیکن اسٹیشن سے احد ہوٹل تک پہنچنے کے بعد تاج بھوپالی صاحب سے جب ملے تو ان کی میزبانی اور شرافت کے رویہ نے آگے بڑھ کر جس گرمجوشی سے ہاتھ بڑھایا اسے دیکھ کر اطمینان ہوا، ملا سجاد حسین بانی سیفیہ کالج اور ملا فخرالدین صاحب نے اردو ادب پڑھانے کے لیے قوی صاحب کا تقرر کیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ ایک مشن کو لے کر انھوں نے سیفیہ کالج کی درسگاہ میں قدم رکھا۔ ارادوں کی تکمیل، ریاضتوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔ طالب علم، علم طلب کرے اور وہ اس کی تشنگی بجھائیں۔ مانا کہ آگہی کی منزلیں بہت دور ہوا کرتی ہیں لیکن استاد کا فرض اولین ہے کہ وہ راستوں کی

نشاندہی کرے۔ قوی صاحب ملا فخر الدین مرحوم (فخرو بھائی) سکریٹری سیفیہ کالج کے ہر
ہر قدم پر ممنون ہوتے ہیں کہ وہ جو پلان بناتے تھے سکریٹری صاحب دشواریاں کھڑی
کرنے کے بجائے آسانیاں بہم پہنچانے میں مدد کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ایک علم دوست
انسان تھے۔

مجلّہ نکلنا شروع ہوا۔ تخلیقی عمل کی طرف طالب علموں کے قدم بڑھنا شروع ہوئے۔
تعریف و تحسین کی آوازیں آنے لگیں۔ کاروانِ سیفیہ، مجلس اردو کی طرف سے بے شمار ادبی
نشستیں ہوتیں۔ یادگار تقریبات اور مشاعرے منعقد ہوتے۔ ادبی چہل پہل سے سیفیہ
کالج گونجنے لگا۔ اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے نئی فکر اور نئے راستے تلاش کیے جاتے
اور ایک مخصوص ادبی فضا پیدا کرنے کے لیے قوی صاحب نے لمحہ لمحہ وقف کر دیا۔ شعبۂ اردو
کا کتب خانہ جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں الماریوں میں نفاست اور ترتیب سے رکھی
گئیں جب نظر اٹھتی ہے تو فکر حیران ہو جاتی ہے۔ ان اقدام کو تحریک اور قوت کہاں سے
ملی۔ ذمہ داری کا احساس اور اردو زبان کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے کس جذبے نے آمادہ
کیا ہوگا۔ کس سوچ اور فکر نے انھیں چیلنج کیا ہوگا کہ خیال نے عملی شکل اختیار کی۔ مشہور و
معروف علمی اور ادبی شخصیات سیفیہ کالج آئیں اور اس سنجیدہ، ٹھوس اور تعمیری کوشش، خراج
تحسین، پیش کی۔ شعبۂ اردو نے جن اکابرین کو خوش آمدید کہا ان میں عبدالماجد دریابادی،
آنند نرائن ملا، سید شہاب الدین دسنوی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، مالک رام، راجندر
سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور کئی دوسرے اہم نام شامل ہیں۔
گوپی چند نارنگ نے اپنے تاثرات کچھ اس طرح پیش کیے:

> ''کوئی بھی شعبہ اپنے سربراہ سے پہچانا جاتا ہے۔ یہاں کہ شعبۂ اردو کا ایک
> نام پروفیسر عبدالقوی دسنوی ہے۔ انھوں نے زندگی اردو تحقیق میں کھپا دی۔
> مجلّہ سیفیہ نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور غالب و اقبال پر جو کام کیا ہے وہ
> دوسروں کے لیے نشانِ راہ ہے''۔

بقول کیفی اعظمی:

> ''بھوپال کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے اور یقین کے ساتھ کہی

جا سکتی ہے کہ یہ ہمارا مرکز تھا اور ہے اگر یہاں کچھ سورج ڈوبے ہیں تو کچھ
طلوع بھی ہوئے ہیں جن سے ہماری تہذیب اور زبان آج بھی کسبِ نور
حاصل کر رہی ہے"۔

۱۹۵۶ء میں ایک مختصر سی تعلیم گاہ کی بنیاد پڑی تھی، لیکن ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بن گیا۔ یہاں نہ صرف بھوپال کے طلبا اور طالبات پڑھتے تھے بلکہ بیرونِ شہر سے بھی طلبا پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اس کامیابی کے لیے قوی دسنوی صاحب، سیفیہ کے بانی ملا سجاد حسین جیسے نیک دل، سچے اور اچھے انسان کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور پھر ان کی نگہبانی کا فرض ان کے بیٹے ملا فخر الدین صاحب نے جس اعلیٰ ظرفی، ذہانت اور خوبصورتی سے نبھایا ان کو زمانہ یاد رکھے گا۔ تصورات کو عملی جامہ پہنانا اور انسانوں کے لیے فلاح کی راہیں کھولنا۔ بلاتفریق مذہب وملت۔ یہ ایک معمولی انسان کا کارنامہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے ایسے طالب علم نکلے ہیں جنھوں نے ملک بھر میں اپنے کالج کا نام روشن کیا۔ اسی ذہنی تربیت گاہ سے شاعر، ادیب، محقق، ناقد، مترجم، صحافی، افسانہ نگار اور ناول نگار مشہور ہوئے۔

تیس سال تک سیفیہ کالج میں رہنے اور اپنے طالب علموں کے ذہنوں سے جڑے رہنے کے بعد ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ یہ گھڑی مخلص اور محبت کرنے والے پروفیسروں اور عزیز اور پیارے طالب علموں سے جدا ہونے کا وقت تھا۔ دوستوں کی بڑی خوبصورت محفلیں جمی تھیں یہاں قہقہہ گونجے تھے۔ ایک دوسرے نے اپنا غم بانٹا تھا۔ یہاں محبتیں پروان چڑھیں تھیں، نفرتوں کے چراغ گل کیے گئے تھے۔ الوداعی تقریر میں قوی صاحب نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس میں جذبات اور احساسات کی وہ دنیا دھڑک رہی تھی جس میں نرم و نازک افکار قلندری اور روحانیت کی تڑپ تھی۔ استاد کی آنکھوں میں خواب ہوتے ہیں شاگرد خوابوں کو پورا کرنے میں عمل پیرا ہوتا ہے وہ خود سے سوال کرتے ہیں کہ کہیں خواب دیکھنے میں کسر تو نہیں رہ گئی۔ دلوں کو متاثر کرنے والی دعا پر انھوں نے اپنی تقریر ختم کی۔

"بمبئی سے بھوپال تک" یہ سفر اسلیے اہم محسوس ہوتا ہے کہ جس غرض کے لیے قوی دسنوی صاحب بھوپال آئے تھے اس کو انجام دینے میں انھوں نے کسر نہیں چھوڑی، اردو

زبان کے لیے جو عرق ریزی کی اور اس کی محافظت اور فروغ کے لیے طالب علموں کی جس طرح ذہنی تربیت کی، سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو میں ایک مربوط اور اثر انگیز فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ مخالف ہواؤں نے چراغ گل کرنا چاہا لیکن ارادوں کے بلند گنبد اسی وقار کے ساتھ کھڑے رہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی آرزو مندیوں اور کامرانیوں کی جھلک اس کتاب میں ہمیں صاف صاف ملتی ہے۔ ماضی کے اوراق الٹ پلٹکر انھوں نے مشفق و محترم شخصیتوں کو یاد کیا ہے جن کی قربتوں نے انسانی رشتوں کی گہرائیوں کو محسوس کرایا۔ یہ خوبصورت یادداشتیں ان کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ بات قاری پر ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ صاحب تصنیف انسانی جذبات اور اس کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں پر یقین کامل رکھتے ہیں اور یہی انسانی دل کی خوبصورتی کی پہچان ہے۔

(۷)

ماہنامہ عاکف کی محفل، نئی دہلی (اگست ۲۰۰۴ء)

تبصرہ نگار: ایس۔ ایم۔ ظفر

"یہ چند اوراق بیتے دنوں کی یادوں کی صورت رکھتے ہیں جنھیں لکھتے وقت کبھی خوشی ہوئی، کبھی جوش و خروش پیدا ہوا اور حوصلہ بڑھا، کبھی تلخ حقائق نے غم زدہ کر دیا"۔

"وہ لوگ جو انسانوں سے نفرت کرتے ہیں، انسانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ان کے تصور سے میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ دراصل یہی لوگ ننگِ انسانیت ہیں"

(اسی کتاب کے ابتدائی صفحات سے)

جب ڈاک سے دو جلدیں موصول ہوئیں تو میرا ارادہ اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں ایسی کتابوں پر تبصرے کا قائل نہیں ہوں، جن پر قیمت درج نہ ہو۔ میرا کام اردو کتابوں کو دنیا کی ان بڑی لائبریریوں تک پہنچانا ہے جہاں تک عام اردو والوں کی پہنچ نہ ہو اور یہ لائبریریاں بغیر قیمت والی کتابیں اپنے یہاں رکھنا بھی معیوب سمجھتی ہیں۔ میرا خالی

وقت شاید بغیر کچھ پڑھے گزر ہی نہیں سکتا۔ محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے نام سے کتابوں کی معرفت شناسائی کے علاوہ صورت آشنائی تک سے محروم ہوں۔ دسنہ جو ماسوائے معروف دسنوی حضرات کے کسی اور بات کے لیے ہندوستان گیر شہرت نہیں رکھتا اور نہ معلوم کیوں میں اسے آج سے قبل اتر پردیش کا کوئی قصبہ سمجھتا رہا۔ جب کہ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ پھلواری شریف (بہار) کے اس گاؤں نے کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں پیدا کی ہیں کاش کے دسنہ کا نام اردو نگر اردو آباد قسم کا ہوتا۔ دسنہ سے زندگی کا سفر شروع کر کے بمبئی کے راستے بھوپال پہنچنے والا یہ شخص کس شہر کا باشندہ ہے مجھے تو لگا کہ یہ اصلی بھوپالی، اصلی بمبئی والا اور حقیقی دسنوی ہے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ بھوپال میں میرے شناسا حضرات کی تعداد بہت محدود ہے۔ سیفیہ کالج کے سابق پرنسپل جناب سید اشفاق علی صاحب معلوم نہیں کیوں مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دو مرتبہ دہلی کا سفر صرف مجھ سے ملاقات کے لیے کیا۔ بھوپال آنے کے لیے بہت اصرار کرتے تھے، نہیں پہنچ سکا۔ حافظ ڈاکٹر ماجد حسین چیف ایڈیٹر اردو ایکشن سے شناسائی، اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے حوالے سے ہے جب کہ سید اوصاف علی صاحب (سابق ایڈیٹر "ریڈینس" ویکلی) جو عرصہ دراز سے دہلی میں مستقل سکونت پذیر ہیں پہلے میرے پڑوسی اور اب باقاعدہ رشتہ دار ہیں۔ بھوپال سے میرا کل تعلق ہے ایک مرتبہ بمبئی کے سفر کے دوران تھوڑی دیر اسٹیشن دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ تو اردو کے اس ادبی اسکول کی زیارت کروں۔ خدا وہ موقع جلد لائے جب میں بھوپال کی فضا میں سانس لے سکوں۔

تو اب جناب ذکر اس ۲۵۶ صفحے کی کتاب کا جس کو شروع سے آخر تک ایک ہی سانس میں یعنی ایک ہی نشست میں پڑھ گیا اور سوچنے لگا ایسا کیوں ہوا؟ عام طور پر میں کتابیں بڑی ترتیب سے پڑھتا ہوں جو پہلے آئی وہ پہلے اور اکثر جستہ جستہ، مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ دوسرا تھا۔ قدرت کی منشا کے خلاف انسان بے بس ہوتا ہے، اس کتاب کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ اگر کوئی کتاب اپنے اندر اتنی طاقت رکھتی ہے کہ اس کا قاری چند سطریں پڑھنے کے بعد پوری کتاب پڑھنے پر مجبور ہو جائے تو اس کو مصنف کی تحریر کی طاقت ہی کہا جائے گا۔ ایسے مصنف بہت کم ہوتے ہیں جو اپنی تحریر کو پڑھوانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ یہ کتاب پڑھ

کر مجھے ظ۔ انصاری کی یاد آ گئی جنھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ظفر میری لکھی تحریر اگر لوگ پڑھنے پر مجبور نہ ہوں تو میرا نام کاغذ پر لکھ کر اس پر پچاس جوتے مارنا۔ میرے ساتھ مل کر وہ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے تھے لیکن ان کی کیفیت بہت جذباتی تھی اور میں ایک پر سکون کام کرنے والا۔ دونوں مزاج مختلف تھے اس لیے میں نے اس سلسلہ میں حامی نہیں بھری ورنہ خطرہ تھا کہ میرا جو تعلق ان کے ساتھ تھا وہ باقی نہیں رہتا۔

دسنوی صاحب نے اس کتاب میں قاری کے لیے بڑے اسرار پوشیدہ رکھے ہیں، جہاں انھوں نے سیفیہ کالج کے ارد گرد رہتے ہوئے دسنہ، بمبئی اور بھوپال کی سیر کرائی ہے وہیں اپنے شاگردوں اور اپنے بڑوں کا حق بھی اس خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی آخر تک باقی رہتی ہے۔ ساتھ ساتھ پڑھنے والا مختلف ایسی محفلوں، انجمنوں اور کانفرنسوں سے کسی قدر واقف ہو جاتا ہے جن سے واقفیت اردو کی تاریخ سے واقفیت ہے۔ بھوپال اور بمبئی میں اردو کی قابلِ احترام شخصیات سے خاصا تعارف ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ دسنوی صاحب کی فکری، سماجی، اخلاقی اور ذہنی اقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے نہایت ادب کے ساتھ ان ناانصافیوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو ان کے راستے میں روڑے بنتی رہی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میری ادائیں دوسروں کو پسندیدہ نہیں ہیں نہ ہوں میرے جذبات کو تو تسکین پہنچاتی ہیں''۔

کل دسنوی صاحب پر تحقیقی کام ضرور ہوگا اور ان کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اہم کتاب ہوگی۔ حالاں کہ قیمت نہیں ہونے کی وجہ سے یہ کتاب شاید ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکے جن کو اس کی ضرورت ہے۔

(۸)

ہندوستانی زبان، بمبئی (اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء)

مبصر: محمد حسین پرکار

''بمبئی سے بھوپال تک'' پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی کچھ یادوں، کچھ تجربات اور کچھ ردِ عمل پر مبنی کتاب ہے۔ کتاب ہاتھ میں اٹھائی تو میری نظر صفحہ نمبر ۲ پر

کتاب سے متعلق تفصیلات میں "قیمت" کے کالم پر مرکوز ہو کر رہ گئی، جہاں لکھا تھا" اردو کی خدمت"۔ جو شخص اردو کی خدمت کے لیے بھاری سے بھاری قیمت چکانے کے لیے تیار ہو اس سے زیادہ اردو کا قدر داں اور کون ملے گا۔ صفحہ نمبر ۹ پر "انتساب" کے جملے بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھا ہے:

> "اردو کے ان خدمت گزاروں کے نام جو نہایت خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اردو کو نقصان پہنچانے والوں اور مفاد پرستوں کی سازشوں کے باوجود اردو کو گھروں میں زندہ رکھنے اور ترقی کی بلند ترین منزل تک لے جانے کا عزم رکھتے ہیں اور اس کوشش میں مصائب اور مشکلات کو برداشت کر رہے ہیں، انھیں یقین ہے کہ مادری زبان ہماری تہذیب کو زندہ رکھے گی اور ہماری تہذیب ہماری پہچان مٹنے نہیں دے گی"۔

صفحہ نمبر ۶ پر جو "چند باتیں" مرقوم ہیں ان میں بھی وہ "آدمیت احترام آدمی" پر یقین رکھنے والے، جنگ و جدال سے نفرت کرنے والے اور قتل و غارت گری و بربریت کو نہ صرف درندگی بلکہ "زوالِ آدم خاکی" سمجھنے والے انسان کے روپ میں ملتے ہیں۔ یہ باتیں انھوں نے والد محترم سے ورثے میں پائیں جو امن و امان کی زندگی کو پسند کرتے تھے اور انسانوں سے محبت کو زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔ صفحہ ۸ پر اپنی نظم بہ عنوان "اے میرے وطن" میں اسی بات کا ذکر کرتے ہیں اور ان باتوں سے نوجوانانِ وطن تک پیغام پہنچانا چاہتے ہیں اور انھیں اپنے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور "یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر" کہہ کر اپنی نظم کا اختتام کرتے ہیں۔

بھوپال میں سیفیہ کالج میں شعبۂ اردو کو ایم۔ اے تک کے درجہ تک پہنچانے میں جو رول عبدالقوی دسنوی صاحب نے ادا کیا اور اردو کے ادبا، وشعرا و ماہرین کو بھوپال کے اس کالج میں مدعو کر کے نئی پود میں جو اردو کا ولولہ پیدا کیا وہ ان کا حصہ تھا اور اس تصنیف میں ساری تفاصیل موجود ہیں لیکن تیس سال مسلسل خدمت کرنے کے بعد جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو بالکل ایسے جیسے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ جانے کتنے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ انھیں یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ اس وقت اور بہت کچھ کیا جا سکتا تھا لیکن

افسوس کہ وہ نہ ہو سکا۔

یقیناً عظیم انسان وہی ہوتے ہیں جنھیں اپنے کیے ہوئے کاموں کا نہیں بلکہ نہ کیے ہوئے کاموں کا احساس رہتا ہے۔

''پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی عظمت کو میرا اسلام''

کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے اردو اکیڈمی مدھیہ پردیش کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو بنیادی نکتہ انھوں نے اٹھایا کہ جب تک بچوں کی اردو تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اردو کے پڑھنے والوں میں کمی آجائے گی۔ لہٰذا ان علاقوں میں جہاں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہیں وہاں اردو تعلیم کے لیے مراکز قائم کیے جائیں جن میں کم از کم ایک جز وقتی (پارٹ ٹائم) استاد رکھا جائے۔

ہائی اسکول اور بارہویں جماعت میں اردو میں اول، دوئم آنے والے طلبا کو اچھے انعام دیے جائیں۔ مختلف یونیورسٹیوں کے بی۔اے اور ایم۔اے میں اول آنے والے اردو طلبا کو بھی انعام دیے جائیں۔ ساتھ ہی دسویں اور بارہویں کے طلبا کے درمیان تقریری اور تحریری مقابلے منعقد کیے جائیں اور ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ اسکول اور کالج کے اساتذہ کو ان نمایاں خدمات کا مناسب انداز سے اعتراف کیا جائے اور محنتی اساتذہ کی ہمت افزائی کی جائے۔ اس کے علاوہ مخلص خدمت گزارانِ اردو کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہندوستان کی دیگر اردو اکادمیوں کی طرح مدھیہ پردیش اکادمی کے پاس بھی اچھی لائبریری ہو اس بات پر زور دیا جائے۔ ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو خوش نویسی سکھائی جائے۔

۵؍ستمبر ۱۹۸۵ء کو مہمانان کا قصر سلطانی میں استقبال کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس شہر میں کن کن اکابرین و عمائدین کی آمد ہوئی ان میں علامہ اقبال، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، گاندھی جی، جواہر لال نہرو وغیرہ، وہ سائنس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سائنس دانوں کا اگر یہ کہنا درست ہے کہ انسان کی آوازیں اور ان کے خدوخال کے عکس فضا میں محفوظ رہتے ہیں جو کبھی بھی سنے اور دیکھے جا سکیں گے تو ہمارے ان بزرگوں کی آوازیں اس کی فضا میں جذب ہوں گی ان کے

درودیوار میں سمائی ہوں گی۔ ان کے خدوخال کے عکس چلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے، بات چیت کرتے، مشکل گتھیوں کو سلجھاتے اس قصر کے اندر باہر محفوظ ہوں گے، کیا عجب کہ کبھی ہمارے سائنس داں اپنے آلات کی مدد سے انھیں دکھا سکیں اور ان آوازوں کو سنا سکیں۔ تب یہ قصر سلطانی دنیا والوں کی نگاہ میں اور زیادہ قابلِ قدر بن جائے گا۔ خصوصاً ہم مسلمانوں کے لیے کہ یہاں شبلی، سرراس مسعود، علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کی آوازیں سنی جا سکیں گی اور انھیں اٹھتے بیٹھتے، بات چیت کرتے دیکھا جائے گا''۔ (ص: ۲۰۴)

''لیکن آج اس زمین کی قدر اور اس محل کی اس لیے اور بڑھ گئی ہے کہ اب یہ قصر سلطانی بھوپال کی اس عظیم دانش گاہ سیفیہ کالج کا ایک حصہ بن گیا ہے''۔ (ص: ۲۰۴)

''مجھے یقین ہے کہ جس قصر سے علامہ شبلی، علامہ اقبال، سرراس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کا عمر کے آخری زمانے میں گہرا رشتہ رہا اور سیاست دانوں میں جہاں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسی ہستیاں آئیں اور جس قصر نے ان کی ہمت افزائی کی، دلداری اور تعاون میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اس قصر کی آغوش میں ہماری عظیم قوم کے عظیم فرزند پروان چڑھیں گے، تعلیمی منزلیں طے کریں گے اور شبلی، سرراس مسعود اور سلیمان بن کر دین و دنیا کی عظیم خدمت انجام دیں گے اور سیاست میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ملک کی نمایاں خدمت کریں گے۔ اس قصر کا اس سے بڑھ کر اور کیا بہتر استعمال ہو سکتا تھا اور اس سے زیادہ اور کیا مقام مل سکتا تھا''۔ (ص: ۲۰۵۔۲۰۶)

وہ سیفیہ کالج کے طلبا کو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا دیکھ کر بے پناہ مسرت اور اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان شخصیات کا کھل کر احترام کرتے ہیں جنھوں نے کالج کو معیاری دانش گاہ تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ سیفیہ کالج کے ساتھی اساتذہ کی خدمات کا اعتراف کھلے دل سے کرتے ہیں، ان کی تعلیمی، تحقیقی مطبوعات کا بار بار ذکر

کرتے ہیں اور اس کا سارا سہرا آصفیہ کالج کے سر باندھتے ہیں۔

جہاں اردو اور اردو والوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اس کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف دوٹوک باتیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ اردو کے ساتھ سیاست دانوں کے ہاتھوں ہونے والی ناانصافیوں اور کھلواڑ پر کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ مدھیہ پردیش اور یوپی میں اردو کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی اسے ظاہر کرنے سے نہیں چوکتے۔

وہ ہمیشہ کی طرح اس کتاب کی پہلی جلد اپنے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی رضا صاحب کو دینا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی پروفیسر عبدالحی رضا صاحب داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اس سانحہ پر انھوں نے اظہارِ افسوس کیا۔

مجھے یقین ہے کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی یہ تصنیف ''بمبئی سے بھوپال تک'' ادبی حلقوں میں بہت سراہی جائے گی۔ میں انھیں بے لوث اردو کی خدمات کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اردو نواز احباب اس کتاب کو مشعلِ راہ جان کر اسی جذبے سے خدمت اردو کے لیے نکل پڑیں گے۔

(۹)

''بمبئی سے بھوپال تک''

از ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں

پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' (یکم دسمبر ۲۰۰۴ء)

ہم بزرگوں، عالموں، عظیم رہنماؤں، نامور ادیبوں یا شاعروں کی سوانح کیوں پڑھتے ہیں؟ اول تو تخلیق کاروں کی تخلیقات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے، دوسرا مقصد ہوتا ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی ہمیں بتاتے ہیں کہ کامیابیاں یوں ہی ہاتھ نہیں لگ جاتیں۔ ان کی زندگی کے پیچ وخم ہمیں جینے کی نئی راہ دکھاتے ہیں۔ ان کے تجربات ہمیں روشنی دکھاتے ہیں کہ کس طرح ڈوب کر ابھرنا چاہیے۔ ان کی سوچ، ان کے عمل، ردِعمل ہمیں سکھاتے ہیں کہ کس طرح بادِمخالف کے سامنے ایک مضبوط اور تناور درخت کی طرح ایک فولادی ستون کی طرح سر بلند اور کامیاب رہا جا سکتا ہے۔ ان کی با اصول زندگی سے ہم سیکھتے ہیں کہ کس

طرح اصولوں کی پاسداری کی جاتی ہے۔ بلند کردار با اصول اور پرعزم لوگوں کی سوانح ہم میں جوش اور ولولہ بھر دیتی ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی یہ کتاب "بمبئی سے بھوپال تک" اگرچہ سوانح نہیں ہے مگر ایک اہم دستاویز ہے، ایک محبِ وطن، محبِ قوم وملت، محبِ زبانِ اردو کی زندگی کی۔ یہ دستاویز ہے ایک دانشمند، تاریخ ساز، پرعزم، ایماندار، مخلص استاد کی زندگی کی۔ یہ دستاویز ہے ایک محقق، ناقد اور انشاپرداز کی زندگی کی جس نے نہ صرف اپنی بے پناہ علمی وادبی صلاحیت کو بروئے کار لاکر تحقیق وتنقید میں بیش بہا اضافے کیے بلکہ ایک ذمہ دار، پاک باطن، پُرشفقت، ہمدرد اور مخلص استاد کی حیثیت سے نہ جانے کتنے طلبا کو ادب کی راہ میں کامیابی کے ساتھ گامزن کروایا۔ جس نے اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اعلیٰ تعلیم کی تدریس کا عظیم کام سرانجام دیا بلکہ سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کو ایک مثالی اور مقتدر ادارہ بنادیا اور شعبۂ اردو کی لائبریری کو ایک گراں مایہ اور پُروقار کتب خانہ بنادیا۔ جس نے اپنی لگن اور کاوش سے سیفیہ کالج ہی نہیں بھوپال کے نام کو بھی دنیائے شعروادب میں روشناس کیا اور بھوپال کو اس کا جائز اور بلند مقام دلوانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی۔

یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے جو انھوں نے اہلِ علم اور اہلِ نظر کی نذر کیا ہے۔ جس کی اہمیت اور تعریف بیان کرنے سے میری زبان قاصر ہے اسے تو صرف اہلِ قلب ونظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

استادِ محترم نے اسے نذر کیا ہے ملک، قوم وملت کو، نیز اردو کے چاہنے والوں کو۔ اسے نذر کیا ہے اردو کے اساتذہ کو اردو کے طلباء کو اور دعوت دی ہے اپنے اہلِ وطن کو۔

"آؤ

محبت کریں اپنے وطن ہندوستان سے

اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں اور بہنوں سے

اپنی تمام ہندوستانی زبانوں سے

آؤ تعصب کا منہ کالا کریں

حسد کو رسوا کریں

ذات پات کے جھگڑے مٹائیں
چھوٹے بڑے انسانی فرق کو ختم کریں
آؤ مساوات کا بول بالا کریں
قومی یکجہتی کا جھنڈا بلند کریں
اتحاد و اتفاق کو مسکراتے دیکھیں
ہر جگہ امن و امان کو رقصاں پائیں
آؤ ملک کو غربت سے نجات دلائیں
نوجوانوں کو علم کی دولت سے مالا مال کریں
خدمتِ خلق کا جذبہ بیدار کریں
فرائض سے آگاہ کریں
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر"

میری دعا ہے کہ ان کی یہ تمام خواہشیں ضرور پوری ہوں۔ اس کتاب کے پڑھنے والے اس کتاب میں ان تمام رویوں کی زندہ تصویر دیکھیں گے اور یقیناً محسوس کریں گے کہ قوی صاحب نے تمام زندگی انھیں مقاصد کو مدنظر رکھ کر مسلسل جدوجہد کی ہے اور اچھے نتائج پائے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے جو کچھ جمع کر دیا ہے اس کی مثال اس بزرگ باپ کی سی ہے جو نہایت کامیاب اور باعمل زندگی گزارتا ہے اور عمر کی پختگی کے ساتھ اپنے بچوں کو اپنی زندگی کے سرد و گرم تجربوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہے تاکہ زندگی میں اپنی کامیابیوں کے راز ان پر منکشف کر دے کہ وہ اس کی زندگی کے تجربات سے روشنی حاصل کر سکیں، وہ زندگی کے سخت مراحل کو ہمت اور بلند حوصلگی کے ساتھ سر کرنا سیکھیں، مایوسیاں کبھی ان کے نزدیک نہ آئیں۔ وہ تجربہ کار باپ شمع فروزاں بن کر اپنے بچوں کو روشنی دکھانا چاہتا ہے تاکہ وہ ٹھوکر نہ کھائیں۔ زندگی کے پُر خطر راہوں کے پیچ و خم سے پہلے ہی سے واقف رہیں، ترقی کی راہوں میں آنے والے تمام مسائل سے نہ صرف آگاہ رہیں بلکہ انھیں حل کرنے کی تراکیب سے بھی ان کی واقفیت ہو جائے۔

استاد محترم نے بھی اپنی زندگی کے وہ تمام اوراق اپنے ملک وقوم کے نوجوانوں کے لیے، بچوں کے لیے، ساتھیوں کے لیے کھول کر رکھ دیے ہیں، جن میں تجربے کی روشنی بھی ہے، جذبے کی تپش بھی، ہمت اور لگن کا درس بھی ہے اور اللہ سے مدد کامل کے یقین کے ساتھ بامقصد جدوجہد بھی۔

قوی صاحب نے زندگی کو ہمیشہ مثبت زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے اگرچہ وہ بھی زندگی میں سخت مراحل سے دوچار رہے ہیں۔ کبھی کبھی گھبرائے بھی مگر مایوس نہیں ہوئے، ہمت نہیں ہاری، حوصلہ رکھا اور عزم کے ساتھ مشکلات کا سامنا کیا۔ مخالفتوں نے انھیں توڑا نہیں، بکھرنے نہیں دیا، بلکہ وہ مزید حوصلہ مندی کے ساتھ اپنے جائز مقاصد کی تکمیل میں سرگرداں رہے اور کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔

بلاشبہ ''بمبئی سے بھوپال تک'' ایک عام تاثراتی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ داستان ہے پُرعزم زندگی اور سربلندی کی جسے نہایت سادہ اور پرخلوص انداز میں انھوں نے تحریر کیا ہے اور اپنی زندگی کو ایک مثال بنا کر تمام پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہم آج کل کے تمام مسائل پر بولتے ہوئے دوسروں کو اس کے لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اپنی ذمہ داری سے منہ موڑ لیتے ہیں یہ کہہ کر کہ سارا نظام بگڑا ہوا ہے، ہم تنہا کیا کر سکتے ہیں۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں جو غلط اور صحیح کا تمیز تو رکھتے ہیں مگر جب بات عمل کی آتی ہے تو اس مقولے پر عمل کرتے ہیں۔ ''ہوا ہو جدھر کی چلو تم اُدھر کو'' اور یہی رویہ سماج کی گرتی ہوئی قدروں کے لیے ذمہ دار ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ خود اپنا محاسبہ کریں اور دوسروں سے زیادہ اپنے رویوں پر نظر رکھیں۔ اس کتاب میں قوی صاحب کی با اصول زندگی کے مرقعے بھی ہیں جن سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔

قوی صاحب کے ذہن میں ان یادوں کے دریچوں میں نہایت خوش نما خوش رنگ پھول سجے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھیں زندگی میں صرف پھولوں سے ہی واسطہ رہا۔ سچ تو یہ ہے جن راہوں پر وہ چلے ان میں بے شمار کانٹے بچھے تھے جن کی چبھن کو کچھ دیر کے لیے انھوں نے محسوس ضرور کیا مگر ان کی خلش کو دل سے لگا کر بیٹھ نہیں گئے۔ آج اگر وہ ان حالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے انھیں تکلیف پہنچی تھی تو محض اپنے شاگردوں کو نصیحت

کرنے کے لیے، ان کی رہنمائی کرنے کے لیے، ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہ مخالفتوں سے ڈر کر اپنے جائز اصولوں سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ اپنی روش چھوڑنا نہیں چاہیے مخالف ہواؤں سے ڈر کر بے عمل بن کر جمود کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے، جس کی بے شمار مثالیں اس کتاب میں موجود ہے۔

استاد محترم اکثر اقبال کا یہ مصرعہ پڑھتے ہیں:

صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور

یہ مثال ان کی زندگی پر بالکل صادق آتی ہے۔ ان کی پیدائش بہار کے چھوٹے سے گاؤں دسنہ میں ہوئی مگر انھوں نے ابتدا سے ہی اس گاؤں کے اہلِ علم و ادب سے ناطہ جوڑا۔ گاؤں کی لائبریری ان کے مقالہ کا موضوع بنی، اچھے لوگوں کی صحبت کی شروع سے ہی ان کی پسند رہی ہے، جس نے ان میں نیکی، پاکبازی، دیانتداری اور حصولِ علم کا شوق پیدا کیا۔

شہد کی مکھی۔ پھولوں پر بیٹھتی ہے اور ان کے رس سے شہد تیار کرتی ہے یہی انھوں نے کیا۔ خود ان کے گرد و پیش اور ان کے خاندان میں جو قابل اور علمی و ادبی حیثیت سے نامور ہستیاں تھیں ان سے قوی صاحب نے تعلق رکھا، ان کی اچھائیاں سیکھیں جیسے علامہ سید سلیمان ندوی، سید نجم الہدیٰ ندوی، سید شہاب الدین دسنوی وغیرہ خود ان کے والد پروفیسر سید سعید رضا سینٹ زیویرس کالج بمبئی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے، جن کے زیرِ سایہ اسی کالج میں استاد محترم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ خود ان کے مطابق:

> "یوں بھی تعلیم گاہوں سے مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے اس کی وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ میرے والد محترم پروفیسر سید سعید رضا صاحب کا تعلق ساری زندگی تعلیم گاہ سے رہا تھا۔ ان کی زبانی سینٹ زیویرس کالج کے حالات اور رواقعات میرے کانوں تک بچپن ہی سے پہنچتے رہے تھے اور میرے دل میں اتر کر اپنا اثر چھوڑتے رہے تھے۔ وہاں کے پادریوں کی نیکی، خوش اخلاقی، شرافت اور انسان دوستی کے واقعات سنتا رہتا تھا اور متاثر ہوتا رہتا تھا۔ وہاں کے مہذب طلبا اور اپنے فرائض سے آشنا اساتذہ کے اخلاق، عادات، کردار، ذہانت اور

علمی فتوحات کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کالج کے اساتذہ اور طلبا کو دیکھنے کا مشتاق ہوتا رہا تھا۔ خود میرے وطن دسنہ کے مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ مولوی علی حسن اور مولوی عبدالرزاق صاحب وغیرہ کی سادگی، سچائی، طلبا سے شفقت، گاؤں والوں سے ہمدردی، دلچسپی اور ان کی اپنی ذمہ داری کے احساس نے میرے بچپن کے شعور اور احساس کو بے حد متاثر کیا تھا''۔

(ص: ۱۲۔ ۱۳)

اسی سلسلے میں ایک جگہ اور تحریر کرتے ہیں:

''میری تربیت ایسے ہاتھوں میں ہوئی جو دنیا کی فلاح چاہتے تھے۔ جن کو تعمیر سے دلچسپی تھی، جو امن و امان کی زندگی کو پسند کرتے تھے، انسانوں کے ساتھ محبت کو زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اور دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔

میں نے بھی اپنے لیے زندگی کو خوبصورت اور پُر مسرت بنانے کا یہی راستہ اختیار کیا اور ہر لمحہ اپنے والدین کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا رہا اور ہمیشہ اپنے والد محترم پروفیسر سید سعید رضا کی طرح فرض شناس استاد کی ذمہ داری نباہنے کے لیے فکرمند رہا، اپنے طلبا کی زندگی کی تعمیر میں لگا رہا اور ان کے روشن مستقبل کا خواہشمند رہا۔

ساتھ ہی اپنے ادارے کی ترقی کے لیے کوشاں رہا، اپنے شہر کو خوب سے خوب تر دیکھنے کا آرزومند رہا اور اپنے وطن ہندوستان کے لیے محبت کے جذبات جگاتا رہا''۔

(بمبئی سے بھوپال تک، ص: ۶۔ ۷)

چنانچہ ایسی ذہنی تربیت، اعلیٰ تعلیم اور تدریسی صلاحیت اور اعلیٰ علمی ادبی ذوق کے ساتھ استاد محترم بھوپال تشریف لائے۔ بمبئی کے مقابلہ میں بھوپال ایک چھوٹا سا شہر تھا اور سیفیہ کالج ایک چھوٹا سا پرائیویٹ کالج مگر وہ مقصد بے حد بلند تھا جس کی خاطر وہ اپنا شہر اور اپنے لوگوں کو چھوڑ کر اجنبی شہر اور نئے لوگوں کے بیچ آئے تھے۔ ان جیسا ہی انسان دوست اور علم پرور شخص سمجھ سکتا تھا کہ سیفیہ کی اس مختصر سی عمارت کے ذرّے ذرّے میں کس

قدر خلوص، کس قدر علم دوستی اور ایثار کا جذبہ گھلا ملا تھا۔ جو ملا سجاد حسین اور فخرو بھائی کے خون پسینے سے کشید تھا۔ اور یہی سبب ہے کہ انھیں یہ شہر اچھا لگا۔ یہ نوکری اچھی لگی جس میں زبان وادب، ملک وقوم کی خدمت کے وافر مواقع موجود تھے ساتھ میں دادا ملا سجاد حسین اور فخرو بھائی جیسے علم شناس شخصیات کا بھرپور تعاون بھی شامل حال تھا۔

بہر حال یہاں آ کر بھی استاد محترم نے اپنی فطرت کے مطابق اچھے لوگوں اور اچھائیوں سے رشتہ جوڑا۔ کم وبیش انھیں شخصیات کا ذکر اور ایسے واقعات ہی اس کتاب میں انھوں نے پیش کیے ہیں جن کے اشتراک سے انھوں نے زبردست تعمیری کام سرانجام دیے۔ قوی صاحب میں بہت خوبی ہے کہ وہ کسی کی نیکی کو بھولتے نہیں، برائیاں وہ فراموش کر جاتے ہیں۔ لوگوں کو کامیاب دیکھ کر وہ کبھی حسد کا شکار نہیں ہوتے۔ ایک سچے انسان کی طرح دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے ہیں۔ انھیں بڑھاوا دیتے ہیں۔ ان کا ذکر بڑے لطف لے لے کر کرتے ہیں۔ یہ چیز اس کتاب میں جا بجا ملتی ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے خود ایک استاد، ایک ادیب کی حیثیت سے انھوں نے کس کس کو کیا کیا دیا ہے۔ اس کا ذکر اس کتاب میں شاید ہی کہیں ملے۔ وہ دے کر بھول جاتے ہیں اور ان کی کامیابیوں پر خوش ہوتے ہیں جنھیں قلم پکڑنا بھی انھوں نے ہی سکھایا ہے مگر احسان جتاتے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ مجھ جیسے نہ جانے کتنے طلبا آج ان کے سہارے اہلِ قلم بن چکے ہیں اور شاید اس کتاب کو پڑھ کر تشنگی بھی محسوس کرتے ہیں کہ جس طرح نامور والد کا نام ولدیت کے خانے میں لکھ کر لوگ خود کو سربلند سمجھتے ہیں ان جیسے استاد کے نام سے وابستہ ہو کر ہم سب خود کو سرفراز اور پُر وقار محسوس کرتے ہیں۔

میں یہاں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ قوی صاحب نے استاد کی حیثیت سے اپنے طلبا کو علم وادب کی جو روشنی عطا کی ہے ان کے بہتر کردار کی تعمیر وتشکیل میں جو حصہ لیا ہے وہ ایک الگ کتاب تحریر کرنے کا مطالبہ کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنے طلبا کو اچھے انسانوں اور مثالی شخصیات کی نیکیاں بتا کر اچھے کاموں کے لیے اکساتے رہے ہیں۔ خود بھی مثال بن کر انھیں راستہ دکھاتے رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قوی صاحب کی اس کتاب کی قیمت روپے یا ڈالر نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس گنجینۂ

جواہر میں وہ گوہر گراں مایہ پوشیدہ ہیں ان کی قیمت میں ناچیز تو کیا کوئی دولت مند سے دولت مند انسان نہیں ادا کر سکتا۔ وہ خلوص وہ انسان دوستی وہ حب الوطنی جن کا مجموعہ یہ کتاب ہے بھلا اس کی قیمت مال و دولت کہاں، اس کا معاوضہ تو وہی ہے جو استاد محترم نے طے کیا۔ ہم استاد محترم کے تجربات عمل اور ردِ عمل، ملک و قوم سے ان کی محبت، شرافت اور نیکی سے، ان کے رشتے علم و ادب اور علمی ادبی شخصیات سے ان کے تعلق، محنت و کاوش سے سبق لیں اور اس کتاب کے پارس کو دل سے چھو کر سونا بن جائیں۔ یہی جذبات اس وقت دل میں مچل رہے ہیں۔

(۱۰)

ماہنامہ ''آج کل'' دہلی (ستمبر ۲۰۰۶ء)

مبصر: بسمل عارفی

''بمبئی سے بھوپال تک'' معروف ادیب عبدالقوی دسنوی کی تازہ کتاب ہے۔ جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں بمبئی سے بھوپال تک کی روداد ہے جو ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے تنقیدی تاریخی اور ادبی نوعیت کے ۱۵ مضامین ہیں۔ ان تمام مضامین میں عام طور پر وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو ماضی میں قوی صاحب اپنے مضامین میں کرتے آئے ہیں اور جس کی وجہ سے ایک حلقہ میں آج بھی انھیں قدر و اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ کا تعلق یادوں سے ہے، جسے آپ یادداشتیں بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اس کتاب میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو ہمارے یہاں رواج پا چکا ہے یعنی خود کو برتر اور بقیہ کو کم تر سمجھنا اور سمجھانا۔ انھوں نے نہ تو خود کو پڑھا لکھا، اثر و رسوخ اور بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے والا بتایا ہے اور نہ ہی اپنی تخلیقات کے شیدائیوں کی بھیڑ اکٹھا کی ہے۔ حتیٰ کہ بڑی بڑی شخصیات کو فرضی لطیفوں سے ڈھیر بھی کیا ہے اس پورے باب میں قوی صاحب نے اپنی علمی، ادبی صلاحیت کا رعب دکھاتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی پروفیسری کا بے جا غرور بلکہ نہایت سلیقہ اور انکساری کے ساتھ بمبئی جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور بھوپال جہاں انھوں نے اپنے ہنر دکھائے ماضی کے اوراق پلٹتے چلے جاتے ہیں۔ دورانِ گفتگو اردو ادب کے آفتاب

اور مہتاب بھی آئے اور ٹمٹمانے والے تارے بھی اور سب کا احترام ان کے یہاں موجود ہے نہ انھوں نے کسی کو سر پر چڑھایا اور نہ کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش کی بلکہ جس کا جو مقام ہونا چاہیے وہیں رکھا ہے، انھیں کسی سے اختلاف بھی رہا تو اس کا اظہار بھی بڑی سادگی سے کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ اپنی بات بھی کہہ دی اور کسی کو برا بھی نہ لگا۔

آج کل سوانحی ناول کے نام پر جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں عشق کی رنگا رنگی خوب دیکھنے کو ملتی ہے۔ فرضی قصہ کسی سے منسوب کر کے بیان کرنے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ بعض مصنفین کا ماننا ہے کہ قارئین کو باندھے رکھنے کے لیے بھی اس طرح کی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ قوی صاحب نے اس سے احتراز کیا اور بغیر کسی چٹ پٹے مسالے کے قارئین کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ کتاب نہ صرف پرانی یادیں تازہ کرتی ہے بلکہ اپنے زمانے کے ادبی ماحول، ادبی شخصیات اور ان کے نظریات سے واقف بھی کراتی ہے، جسے قوی صاحب بڑی سادگی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں، جس میں ایک عہد سانس لے رہا ہے۔ ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے اور اپنے اسلاف سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کسی قیمتی تحفے سے کم نہیں ہے۔

☆☆

خطوط

(۱)
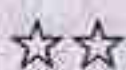
بھوپال

۱۴ر مئی ۲۰۰۴ء

مکرمی جناب دسنوی صاحب   السلام علیکم!

''بمبئی سے بھوپال تک'' اقبال مسعود صاحب نے لاکر دی۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ!

پوری کتاب پڑھ لی، دراصل کتاب کیا ہے سیفیہ کالج کی ادبی خدمات اور خود آپ کی سوانح حیات ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''آدمیت احترام آدمی پر آپ کا یقین ہے'' اور یہ کتاب اسی کا ثبوت ہے کہ سیفیہ کالج کو آپ جیسا استاد اور بھوپال کو ایسا مشفق دوست ملا۔

بھوپال کیوں کہ میری جائے پیدائش ہے، میرا وطن ہے۔ اس کے بارے میں عظیم اور مختلف مصنفین جیسے خواجہ احمد عباس، گوپی چند نارنگ، آنند نرائن ملا، ڈاکٹر خلیق انجم، مالک رام وغیرہ کے خیالات پڑھ کر بھوپال کی عظمت اور محبت بڑھ گئی۔ واقعی آپ حساس طبیعت کے مالک ہیں، اس لیے آپ نے لوگوں کو گہرائی اور باریکی سے دیکھا ہے، وہ آپ کا ہی حصہ ہے۔

بہر حال میں آپ کو اتنی اچھی تخلیق پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

شاہجہاں غنی

سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی

(۲)

بمبئی۔ ۲۰ر مئی ۲۰۰۴ء

جناب محترم عبدالقوی صاحب   آداب!

آپ کی تخلیق ''بمبی سے بھوپال تک'' موصول ہوگئی۔ آپ نے ایک پرانے ساتھی کو یاد رکھا، یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ میں نے یہ کتاب پہلی فرصت میں ختم کرلی۔ آپ نے

بہت ہی شگفتہ، رواں اور سلیس زبان میں ''بمبئی سے بھوپال تک'' کا منظر اس طرح پیش کیا ہے کہ سارے کردار جیتے جاگتے نظروں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ آپ نے بڑے خلوص سے قدم اٹھایا ہے اور موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ ویسے تو ہر منظر ہر واقعہ دلچسپ ہے مگر جہاں آپ نے بمبئی کا ذکر کیا ہے تو اس سلسلہ کی ایک ایک تصویر نظروں میں گھوم گئی۔ ایک ایک یاد تازہ ہوگئی۔ خاص طور سے نوجوان مصنفین کی سرگرمیاں اور کانفرنس کی روداد مزہ دے گئی۔ افسوس ہمارے بہت سارے ساتھی یا تو ہم سے بچھڑ گئے یا تھک کر بیٹھ گئے۔ بچھڑنے والوں میں یوسف منان، فاروق شجاع، پریتم بیلی، عزیز جاوید، افتخار اعظمی، ابوبکر مرچنٹ، محمود چھاپرا، کامریڈ عبدالجبار اور بزرگوں میں سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، کرشن چندر، بیدی جی، مہندر ناتھ، عصمت چغتائی غرض کہ ایک کہکشاں تھی جس کا ایک ستارہ اپنی جگہ ایک دنیا تھا، روشنی کا ایک مینار تھا۔ اب ہر طرف اندھیرا ہے مگر اتنا گہرا بھی نہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں، کیوں کہ میرا یقین ہے کہ نور کی کرن اندھیرے سے ہی پھوٹتی ہے۔ تحریک ختم نہیں ہوئی، اس کے قدم سست ضرور پڑ گئے ہیں، مگر جب یہ قافلہ آگے بڑھے گا تو بہت سارے لکھنے والے پھر آئیں گے پھر کام ہوگا۔ افسوس حمید صورتی دو مہینے پہلے گزر گئے۔ اب میں آپ کی کتاب عوامی ادارے کی نذر کر دوں گا۔ اور ہاں آپ کی کتاب میرے لیے بہت معاون ثابت ہوگی۔ اس کتاب میں میری زیر تکمیل کتاب ''ترقی پسند ادبی تحریک اور بمبئی'' کے لیے بہت سارا مصالحہ ملے گا۔ شکریہ بہت بہت

نیاز مند

عنایت اختر

(۳)

نوساری گجرات

۲/جون ۲۰۰۴ء

محترم جناب عبدالقوی دسنوی صاحب　　　　السلام علیکم!

آپ کی نئی کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' رانچی میں محترم علی بھائی کی معرفت

موصول ہوئی۔ کافی دنوں کے بعد اور گجرات میں رہتے رہتے اردو سے کچھ تعلق کم ہونے کی وجہ سے آپ کی کتاب ہم نے دو گھنٹے میں پوری کردی۔ ویسے آپ کا تذکرہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے اور آپ کی ادبی مشغولیت کا میں قائل ہوں۔ ایسے لوگ اس زمانے میں اب گنے چنے ہی رہ گئے ہیں۔

اس کتاب میں خاص کر آپ کے Fare Well کی تقریر اور ٹرین میں شیلا بہن کی گیا ریلوے اسٹیشن پر اتر کر ان کی مدد کرنا اور خیال رکھنا وغیرہ نے مجھے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ آپ کی سیفیہ کالج کے Fare Well کی تقریر نے ہم جیسے نوکر پیشہ لوگوں کے لیے ایک مشعلِ راہ عطا کی ہے۔ جو باتیں ہم سوچتے ہیں اسے آپ نے قلمبند کردیا۔ ویسے علی بھائی نے ایک کتاب مجھے بھی دی ہے اس لیے اس کے تاثرات ہم آپ کے سامنے بہت زیادہ پیش نہیں کر سکے ہیں کیوں کہ سورج کو چراغ دکھانے کی مثل ہوگا۔ پھر بھی میں یہاں اپنے اردو دوستوں کو ضرور پڑھواؤں گا اور آپ کا غائبانہ تعارف بھی کراؤں گا۔

آپ کی تحریر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے سکریٹری کی حیثیت سے جو آپ نے الگ الگ واقعات اور اصلیت کو جاگر کیا ہے، بہت ہی پسند آیا۔ اقبال کا شعر اور اس کی تپش کو بہت دنوں بعد آپ کی اس کتاب میں محسوس کیا۔ اردو میں ہم شاید یہ خط چھ سال بعد لکھ رہے ہیں کیوں ٹیلی فون کے زمانہ میں اب لکھنا کم ہوگیا ہے اس وجہ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو درگزر کریں۔

فقط

آصف

(سید محمد آصف)

(۴)

نئی دہلی

۱۰رجون ۲۰۰۴ء

سر!

"بمبئی سے بھوپال تک" میں نے محبت کے ہاتھوں سر پر رکھی اور عقیدت کی آنکھوں سے حرف حرف متعدد بار پڑھی، کئی جگہ پلکیں نم ہوگئیں اور اکثر مقامات پر ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ آپ نے از راہِ ذرّہ نوازی چند مواقع پر جس لطف وعنایت کے ساتھ

مجھ ہیچمداں کا ذکر کیا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

اپنے سراپا صفات استادی محترم کی نگارش سے متعلق میں کیا اور میری رائے کیا۔ بلاشبہ اردو دنیا اس کی قدر کرے گی اور یہ چراغ آنے والے دور میں لاکھوں نئے چراغ روشن کرے گا۔ اپنی بکھری ہوئی خاص نوع کی تحریروں کو آپ نے جس طرح ایک رشتے میں پرو کر نیا روپ دیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

کتاب کا سب سے اہم تخلیقی نکتہ اس کی قیمت میں مضمر ہے باور کیجیے اس کتاب کی قیمت انشاء اللہ اپنی آخری سانس تک ادا کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنے بچوں اور ان کے بچوں پہ بھی یہ قرض چھوڑ جاؤں گا۔ خداوند قدوس آپ کو صحت و بشاشت کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین!

گھر سے گھر میں واجبات۔

والسلام

آپ کا خادم

مظفر حنفی

(۵)

علی گڑھ

۱۱ر جون ۲۰۰۴ء

محبی پروفیسر عبدالقوی صاحب　　　　السلام علیکم!

۲ر جون کا روانہ کیا ہوا پیکٹ آج دو پہر کو ملا۔ تھوڑی دیر پہلے ریاض الرحمٰن شیروانی صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر ڈاک پہلے آتی تو اسی وقت انھیں ان کا نسخہ دے دیتا۔ اب کسی معتبر آدمی کے ذریعہ انھیں بھجواؤں گا۔ حبیب منزل یا کانفرنس کے دفتر۔

کیا کانفرنس گزٹ آپ کو پہنچا؟

ابھی دو پہر کو بستر پر آرام کرنے کے لیے لیٹا تو آپ کی کتاب اٹھالی۔ ۱۲۶ صفحے پڑھ گیا یعنی ملا سجاد حسین کی وفات تک۔ میں ایک بار جب بھوپال گیا تھا تو یاد آتا ہے آپ نے ان سے ملایا تھا۔ میں آپ کے شعبہ بھی گیا تھا اور تعجب نہیں رجسٹر پر اپنے کچھ تاثرات

بھی لکھے ہوں۔ دوسری بار تو آپ کے ساتھ عیدگاہ ہلز پر نہیں سیفیہ کالج کے احاطہ میں آپ کا مکان تھا بچے آپ کے اس وقت چھوٹے چھوٹے تھے اس موقع پر آپ نے فخرالدین صاحب سے ملایا تھا۔ ان کی صورت شکل حافظے میں اب بھی محفوظ ہے۔

ایک جگہ آپ نے سرسری طور پر مسعود صدیقی مرحوم کا ذکر کیا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ان پر تفصیل سے لکھتے، لیکن آپ کو بہت کچھ لکھنا تھا اس لیے آپ تفصیل میں نہ جا سکے۔

بہت اچھے اور پسندیدہ موضوع پر بہت دلچسپ کتاب آپ نے لکھی ہے۔ اچھا ہے بہت سے تاثرات اب قلم بند ہو کر محفوظ ہو گئے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ماشاءاللہ بہت اچھی ہے ان میں کئی اہم نام ہیں۔

شعبے میں دوسرے کن صاحب کا تقرر ہوا تھا جن کے بارے میں رائے اچھی نہیں تھی اور پھر آپ کو بھی تجربہ ہوا۔

آج رات کو انشاءاللہ کتاب ختم کرلوں گا۔ آپ نے یاد رکھا ممنون ہوا۔

والسلام

مختارالدین احمد

(۶)

نئی دہلی

۱۵ر جون ۲۰۰۴ء

مکرمی السلام علیکم!

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

نعمان بھائی کے ذریعہ آپ کی گراں مایہ تصنیف ''بمبئی سے بھوپال تک'' موصول ہوئی۔ یادفرمائی کے لیے شکرگزار ہوں۔

نعمان بھائی جان سے اکثر آپ کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ ان کی مرتب کردہ کتاب ''عبدالقوی دسنوی — ایک مطالعہ'' پڑھنے کے بعد آپ سے غائبانہ طور پر متعارف ہوا، تب سے ہی ملاقات کا مشتاق ہوں۔

مرسلہ نئی کتاب ہر اعتبار سے بے حد خوبصورت، دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ آپ نے

بیتی یادوں کو زبان عطا کردی ہے۔ کتنے واقعات ایسے ہیں جو تازیانۂ عبرت بھی ہیں اور مسرت وانبساط کا باعث بھی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

کتاب پر تبصرہ کررہا ہوں، اسے کتاب نما میں شائع کرانے کا ارادہ ہے۔

دعاؤں کا طالب

نیازمند

عبدالحنان

این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

(۷)

نئی دہلی

۲۱رجون ۲۰۰۴

محترمی، معظمی تسلیم!

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کے اتنے گراں قدر تحفے کا شکریہ ہی تاخیر سے ادا کررہی ہوں۔

"بمبئی سے بھوپال تک" میں نے تو اسی وقت پڑھ لی تھی، بہت مزہ آیا مگر خط نہیں لکھ سکی، کچھ گھر کی پریشانیاں، میری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور کچھ کام بھی ہاتھ میں تھے جن کو خاص مدت میں پورا کرنا تھا اور ان کا تعلق آپ کی کتاب کی قیمت سے تھا اور امید تھی کہ آپ یہ جان کر اس تاخیر کو فوراً معاف کردیں گے۔ آپ کو خط لکھنا وہ بھی اس کتاب کے بارے میں، فرض نہیں تھا جسے جلدی جلدی ٹال دیتی۔ وہ ان کاموں میں سے تھا جو دل کے قریب ہیں اور جنھیں کرکے خاص مسرت کا احساس ہوتا ہے اور یہ آپ جانتے ہی ہوں گے زندگی میں یہ کام ہمیشہ پیچھے ڈالنا پڑتے ہیں۔

ذکر بمبئی اور خاص طور سے بھوپال کا اور پھر بیاں آپ کا، مزہ آگیا۔ ایک خاص زمانے اور اس زمانے کی شخصیتوں سے ملاقات ان کے احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کرکے عجب سکون کا احساس ہوا۔ اس دوران جو تلخ تجربے ہوئے ہوں گے ان کا تو ذکر

آپ نے کیا ہی نہیں اگر ہے تو بین السطور۔ اس کے خوشگوار پہلوؤں کو پڑھ کر عجب مسرت کا احساس ہوا۔

آپ جیسے لوگوں سے دور بیٹھ کر بھی ہمیں بہت حوصلہ ملتا ہے۔ آپ کے شاگردوں کے ذریعے آپ سے زیادہ سے زیادہ واقفیت ہو رہی ہے اور عقیدت کے احساس میں اضافہ ہو رہا ہے خاص طور سے نعمان جب سے ہمارے ساتھ رہنے لگے ہیں میں اور میرے خاندان کے سارے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ صالح نوجوان کا لقب ہی ان کو دیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں نعمان جیسے شریف، تہذیب یافتہ انسان کو دیکھ کر بڑی تقویت ملتی ہے۔

بہت دل چاہتا ہے کہ بھوپال آؤں اور آپ سے نیاز حاصل کروں مگر ادھر کچھ عجیب الجھنوں میں ہوں، دعا کیجیے ان سے نکل جاؤں تو ضرور آؤں گی اور اس سفر کا مقصد صرف آپ سے ملاقات ہوگا، نہ کوئی جلسہ نہ جلوس نہ سمینار نہ الابلا۔

میری طرف سے گھر میں سب کو سلام و دعا۔

خاکسار

صغرا مہدی

(۸)

بمبئی

یکم جولائی ۲۰۰۴ء

حبیب لبیب محترم قوی میاں السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت و زندگی اور سکون دل و دماغ کی دعا کرتا ہوں۔ ۱۹ر مئی ۲۰۰۴ء کو آپ کا تحفۂ دل پذیر یعنی مطبوعہ خود نوشت بہ عنوان ''بمبئی سے بھوپال تک'' ملی۔ از حد مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنی قیمتوں یادوں، تلخ و شیریں تجربات اور ان کے ردِ عمل کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ گویا میرے منہ کی بات چھین لی — میں آپ سے مخلصانہ فرمائش کرنے والا تھا کہ دوسروں کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے اب اپنے بارے میں بہت کچھ لکھیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے ذہنِ اقدس میں خود بخود یہ خیال ابھر

آیا اور خود سے فعل میں ڈھل گیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ موجودہ نسل سے کہیں زیادہ آنے والی نسلیں اس سے حسب توفیق الٰہی استفادہ کریں گی۔

شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی

میرا ناچیز خیال یہ بھی ہے کہ آپ کی وقیع تصنیف ''متاعِ حیات'' بمبئی سے بھوپال تک کا باب اول یا مقدمہ Prologue ہے البتہ مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات آپڑی ہے۔

آپ نے میرے پیکٹ میں اپنی مذکورہ کتاب کا ایک نسخہ برادر گرامی قدر جناب باقر مہدی صاحب کے لیے بھی رکھا ہے — مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اب میں چلنے پھرنے سے قریب قریب معذور ہوتا جارہا ہوں اور جناب باقر مہدی صاحب کارٹر روڈ (باندرہ) میں قیام پذیر ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا معتبر آدمی بھی نہیں ہے جس کے ہاتھ کتاب باقر صاحب تک بھجواؤں۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ اسے کوریئر سروس کے ذریعہ موصوف تک پہنچادیا جائے لیکن پہلے آپ سے اجازت لے لوں تو یہ اقدام کروں۔

مکتبہ جامعہ میں بھی اب اپنا کوئی ہمدرد اور قابلِ اعتماد شخص نہیں رہ گیا۔ بہرحال آپ کی امانت میرے پاس محفوظ ہے۔

بھابھی صاحبہ محترمہ کو سلام اور بچوں کو دعائیں کہیے۔

آپ کا بھائی
مجاہد حسین حسینی

(۹)

بھوپال
۱۵؍جولائی ۲۰۰۴ء

محترمی نیازمندانہ خلوص

آپ کا نایاب تحفہ ''بمبئی سے بھوپال تک'' مل گیا۔

انسان اور خاص طور سے تخلیقی فنکار جب طبعی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی تخلیقی اور علمی

صلاحیتوں پر جوانی آتی ہے۔ علم کی دیوی کا مزاج تمام تر حسینوں سے مختلف اور متضاد ہوتا ہے، حسن کی دیوی نوجوان کی آغوش کی طالب ہوتی مگر علم کی دیوی نوجوانی کو حقارت سے دیکھتی ہے اور پیرانہ سالی کے لیے آغوش وا کر دیتی ہے:

گھٹا زور، مشق سخن اور بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

بھوپال میں رہ کر آپ نے اردو کی تعلیم کو خصوصی شعبۂ حیات کا درجہ دیا یہ تو آپ کے طالب علم بہتر جانتے ہوں گے، لیکن میں نے آپ کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے، اس لیے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ ایک رمز شناس صاحبِ فکر، صاحبِ نظر اور صاحبِ بصیرت نثار ہیں۔ تحقیق میں ہمہ گیری ہے اور جو کچھ لکھتے ہیں وسعتِ نظر کشادہ ذہنی سے نہ صرف اردو زبان و شعر و ادب بلکہ ملک سے محبت کا جذبہ آپ کی روح میں رچا بسا ہے جو نفس کی شرافت کی دلیل ہے۔

آپ کی یادداشتیں میری یادداشتوں کو سنوار گئیں ۔ خدا کرے صحت مند رہ کر اسی طرح زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

نیاز مند
نعیم کوثر

(۱۰)

اُجین
۲۴؍جولائی ۲۰۰۴ء

محترم عبدالقوی دسنوی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

استاد محترم آفاق حسین صدیقی کے توسط سے آنجناب کا عطیہ ''بمبئی سے بھوپال تک'' ملا۔ شکریہ ادا کرنے میں تاخیر کا سبب یہ رہا کہ جی چاہتا تھا کہ پڑھ کر اپنی رائے کے ساتھ شکریہ ارسال کروں محض اس بنا پر رسید تک نہ بھیج سکا۔ معذرت چاہتا ہوں۔

کتاب پوری اب تک نہ پڑھ سکا ہوں جو کچھ پڑھا ہے اس نے آپ کی پُرخلوص شخصیت کا بے حد و حساب مداح بنا دیا۔ کیوں کہ دل کا خلوص جب اظہار کے لیے قلم کا

سہارا لیتا ہے تو قاری کے قلب پر ضرور دستک پہنچنے لگتی ہے۔ دسنہ، بمبئی اور پھر بھوپال پر سیر حاصل معلومات کے ساتھ اہم امور اور شخصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے بہت کچھ بتادیا ہے جو اگر یہ کتاب نہ آتی تو ہمارے جیسے بہتوں کو ان کا علم بھی نہ ہو پاتا۔ آپ کا خلوص قدم قدم پر جادو جگاتا آگے بڑھتا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اردو کے لیے، اردو والوں کے لیے اور بھوپال کے لیے جو درد اور خلوص آپ کے قلب وجگر کو گرمائے ہوئے ہے، اس کی قدر دانی بے حد ضروری ہے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ کی خواہش کے باوجود بھوپال کے آس پاس کی اردو بستیاں آپ سے صحیح ربط پیدا نہ کر سکیں ورنہ ان پر بھی آپ کے بصیرت افروز مضامین قلمبند ہو کر حوصلہ افزائی کا موجب ہوتے۔ بہر حال اس کی تلافی کے لیے آپ سے رجوعات کرنا چاہوں گا۔ امید کہ آپ اس پر بھی خصوصی توجہ فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ مادھو کالج اجین میں منعقدہ سمینار ماہ دسمبر ۲۰۰۴ء میں انشاء اللہ مزید گفتگو ہوگی۔ امید ہے کہ مزاج مبارک بعافیت ہوگا۔

والسلام

ظفر محمود

(۱۱)

حیدر آباد

۲۵ر اگست ۲۰۰۴ء

محترم المقام ومکرمی جناب عبد القوی دسنوی صاحب

سلام اللہ علیکم وعلیٰ من لدیکم!

عزیزی محترم مولوی سید یعقوب میران صاحب مجتہدی سابق ناظم دارالترجمہ کے ذریعہ آپ کی تصنیف ''بمبئی سے بھوپال تک'' نظر نواز ہوئی۔ یاد فرمائی کا بے حد شکریہ۔ کتاب اس قدر دلچسپ اور تجربات سے معمور تھی کہ شروع کیا تو معلوم نہ ہوا کہ کتاب کب ختم ہوئی۔ واقعات کا تسلسل، طرزِ بیان اور آپ کے مزاج کا استحکام سرتا پا دعوتِ عمل ہے، سچ تو یہی ہے "من اجتھدا وجد"

اردو کے ادیبوں کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کی بدولت آج بھی اردو زندہ زبانوں میں شامل ہے، جس میں آپ کی شخصیت بھی شامل ہے۔

پھر ایک بار یاد فرمائی کا شکریہ۔

ابوالہادی سید محمود اکیلوی
(صدر و شیخ الجامعہ)
الجامعۃ دائرۃ العلوم الاسلامیہ یکمنار

(۱۲)

کراچی۔ ۱۶ر ستمبر ۲۰۰۴ء

مکرمی سلام مسنون

آپ نے جس تحفہ گراں مایہ پر ۲۰ر جون کو اپنی محبت اور وضع داری کا نقش ثبت فرمایا تھا وہ ۱۰ر ستمبر کو باصرہ نواز ہوا۔

خواجہ صاحب (مشفق خواجہ) سے اب بعض اوقات مہینوں ملاقات کا موقع نہیں ملتا۔ موصوف مقام استقرار و قیام تک جس زینے کو عبور کرنا پڑتا ہے اس کا خوف دل پر پل صراط کے خوف کی طرح طاری ہے۔ جب سے دل کی تکلیف ہوئی اور زندگی میں پہلی بار اسپتال کی سیر کر کے آیا ہوں زندگی سے خوف زدہ ہوں گیا ہوں۔ دوا پر ہزار احتیاط پر شب و روز کی گزران ہے۔ زندگی کو بہت محدود کر لیا ہے اور شوق و ہوس کا دامن سمیٹ لیا ہے۔ مصروفیات برائے نام رہ گئی ہیں آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ خدا جزائے خیر دے۔

آپ نے شوق تدریس قوم کی تعمیر میں حصہ لیا اور اپنے ذوق تحقیق و تصنیف سے ایک تاریخ بنائی ہے۔ فکر کے رُخ موڑے ہیں۔ نظر کے زاویے بدلے ہیں اور اپنے شریفانہ رویے اور زندگی میں رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی مثال قائم کی ہے۔ میں نے مختلف اوقات میں جو بہتر سے بہتر سوچا ہے آپ اس سے بہت بلند ہیں۔ آپ علم و تہذیب کی ایک علامت بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس علامت کو تادیر قائم رکھے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب
ابوسلمان شاہجہاں پوری

(۱۳)

مبارک پور

۲۴ر ستمبر

گرامی قدر عبدالقوی صاحب   سلام ورحمت

امید ہے مزاج اقدس بفضل باری تعالیٰ بخیر و عافیت ہوگا۔

بعد سخن دیگراں

۲۴ر ستمبر کو آپ کی مایہ ناز تخلیق نظر نواز ہوئی شکریہ۔ سرورق کو دیکھتے ہی آنکھیں استعجاب و خوشی سے پھیل گئیں۔ ''بمبئی سے بھوپال تک'' کا سرسری جائزہ لینے کے بعد انکشاف ہوا کہ آپ نے اس کتاب کو بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے تخلیق کی ہے۔ یقیناً یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہے الغرض آپ ہی جیسے اردو کے قدرداں حضرات کی وجہ سے آج اردو عالمی زبان بنتی جارہی ہے۔ خدائے واحد سے دعا ہے کہ آپ جیسے اردو کے سچے خیر خواہ کی عمر دراز ہو۔ آمین!

میں آپ کا صد ہا ممنون ہوں کہ آپ نے کتاب ارسال فرما کر ناچیز کو عزت دی۔

فقط والسلام

خیر اندیش

فراز ادیبی

(۱۴)

کولکاتا ۱ے ۲ر ستمبر ۲۰۰۷ء

مکرم و محترم دسنوی صاحب   سلام مسنون!

آپ کی مرسلہ کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' چند روز قبل موصول ہوئی اور جب تک ختم نہیں ہوگئی ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اس نعمت غیر مترقبہ کے لیے ممنون کرم ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ آپ کی خودنوشت ہے جس میں دسنہ، بمبئی اور بھوپال کے شب و روز، سرگزشت آپ نے نہایت دلچسپ انداز میں رقم فرمائی ہے۔ اس ذیل میں بہت سی شخصیات سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے بہت سے اداروں کی سیر کا لطف بھی آجاتا

ہے اور بہت سے دلچسپ واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اردو اور اہلِ اردو سے آپ کا جو گہرا تعلق ہے اس کی جھلکیاں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ آپ کے بیان کی دلکشی اور زبان کی شگفتگی بھی پائے شوق کو ٹھہر ٹھہر کر چلنے اور محظوظ ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ آپ کا قلم اس عمر میں بھی جس طرح رواں دواں ہے وہ کم از کم میرے لیے باعثِ رشک ہے۔ کتاب کی اشاعت پر دلی ہدیہ تبریک قبول کیجیے۔

امید ہے آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔

نیاز کیش
علقمہ شبلیؔ

(۱۵)

بھوپال
۱۸؍اکتوبر ۲۰۰۴ء مطابق ۳؍رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

محترم عبدالقوی دسنوی صاحب!

برادرم کامل بہزادی کے توسط سے آپ کی کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' ملی۔ بہت بہت شکریہ۔

میں نے اس کتاب کا مطالعہ (ماہ رمضان کے مبارک دنوں میں بھی) صفحہ اول سے لے کر صفحہ آخر تک ۲۵۶ تک نہایت کھلے دل و دماغ کے ساتھ کیا۔ آپ کی بہت کچھ یادیں، بہت کچھ تجربات اور بہت کچھ ردِ عمل نے مجھے بھی مسلسل جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔

''نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو'' (غالبؔ)

کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' جس میں شہر غزل بھوپال کو غالب، اقبال اور سیفیہ کالج کے مثلث میں نہایت خوبصورتی سے سمویا گیا ہے۔ دنیائے ادب اور شہر بھوپال کے لیے ایک لاجواب تحفہ سے کم نہیں۔

قبلہ! حالاں کہ میں بھوپال میں پیدا ہوا۔ بھوپال ہی میں پلا بڑھا لیکن ''بمبئی سے بھوپال تک'' پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے میری جانکاری بھوپال کے بارے میں

بہت ہی معمولی تھی۔ اسے آپ میری بے مائیگی کہہ سکتے ہیں۔

حضرت! جس طرح اس کتاب نے مجھے روشن کیا اسی طرح یہ کتاب بھوپال کی آنے والی ادبی نسلوں کو بھی منور کرتی رہے گی۔ ایسا مجھے یقین ہے۔

آخر میں ایک دوہا:

بمبئی سے بھوپال تک راہ نہ تھی آسان
عزم قوی کی دھوپ نے پگھلا دی چٹان

خدا آپ کو ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔

ناچیز شفق تنویر

(۱۶)

نئی دہلی۔ ۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء

محترم دسنوی صاحب السلام علیکم

آپ کے عزیز نعمان صاحب کی معرفت "بمبئی سے بھوپال تک" (کچھ یادیں، کچھ تجربات، کچھ ردعمل) ملی، جب سے میں نے اردو نثر پڑھنا شروع کیا، دسنہ کا نام اکثر سننے میں آتا رہا۔ سید سلیمان ندوی اور دوسرے تمام بزرگوں کی تحریریں ہم تمام دوستوں کے علم میں اضافہ کا سبب بنیں۔

میرا تعلق دربھنگہ سے ہے اور آپ نے ایسی تاریخی کتاب میں دربھنگہ کا ذکر اپنے بڑے چچازاد بھائی پروفیسر منظر الحق صاحب کے توسط سے کیا ہے۔

کتاب کی نثر سادہ، رواں دواں اور صاف وشفاف ہے۔ اتنی خوبصورت کتاب اور یادوں کے لیے آپ کو تہہ سے مبارک باد دیتا ہوں اور آپ بزرگوں سے اپنے لیے دعاؤں کا طلبگار بھی ہوں۔ کتاب پر مزید تفصیلی مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

فقط دعاؤں کا طالب

ندیم

(ڈاکٹر ندیم احمد)

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

گورکھپور

۳رفروری ۲۰۰۵ء

محترم السلام علیکم!

آپ کا بیش بہا تحفہ مجھے نومبر ۲۰۰۴ء ہی میں موصول ہوگیا تھا۔ ذرہ نوازی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ کسی کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیے بغیر اس پر تبصرہ کرنے کو میں پیشہ ورانہ عمل سمجھتا ہوں جیسا کہ زیادہ تر تبصرہ نگار کرتے ہیں۔ میں زندگی کی ۸۰ ویں منزل میں قدم رکھ چکا ہوں، دیگر اعضاء کے ساتھ آنکھ بھی اپنے فرائض میں کوتاہی کرچکی ہے۔ چند اوراق کے مطالعہ کے بعد آنکھیں احتجاج کرنے لگتی ہیں۔ لیکن میں نے روزانہ چار چھ صفحات پڑھ کر آپ کی وقیع کتاب کا مطالعہ کر ڈالا۔

مجھے کئی حضرات کی آپ بیتی کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان میں سے چند ہی ایسی ملیں جن میں صاحبِ تحریر غمِ روزگار یا یارانِ مہرباں کی نیش زنی کے اظہار سے اپنی تحریر کو بچا سکا ہے۔ کانٹے چبھنے کے بعد آہ کو ہونٹوں کے نیچے دبا لینا ہر شخص کے بس کا نہیں ہے، لیکن آپ کی تحریر کو اس سے مبرّا پایا۔ کتاب پڑھنے سے یہ علم ہوا کہ آپ زندگی کی کٹھن گھڑیوں سے گزرے ہیں لیکن ان طوفانِ حوادث سے ہنستے کھیلتے گزر گئے ہیں۔ جن لوگوں سے آپ کو نقصان پہنچا یا دل آزاری ہوئی ان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے آپ نے سنجیدگی اور شرافت کا دامن نہیں چھوڑا ہے لیکن یہ آپ کا حسنِ تحریر ہے کہ عیب پوشی کے باوجود قاری ان کے بارے میں پورے طور سے واقف ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے آپ سے حسنِ سلوک کیا ہے ان کی تعریف دل کھول کر کی ہے یہ آپ کی احسان شناسی، شرافتِ نفس اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے۔ کچھ حضرات اپنی آپ بیتی میں اپنی ذات کو محور بنا کر صرف اسی کے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ آپ کی کتاب سے واقعات، حالات، ملکی کوائف، سیاسی حالات اور بہت سے لوگوں کے بارے میں علم ہو جاتا ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ آپ کی کتاب نے میری معلومات میں کافی اضافہ کیا ہے۔ آپ کی انسان دوستی، بلند نظری، عفو تقصیر کی عادت، احسان شناسی، بحیثیت استاد اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کو

فرض سمجھنا ان اوصاف نے آپ کو بہت بلند قامت کر دیا ہے۔ آپ نے اپنی محنت اور لگن سے اپنے کالج کے شعبۂ اردو کی افادیت اور وقار کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوپال میں اردو کی ترویج و ترقی میں آپ کا بہت حصہ ہے۔ اردو میں آپ نے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں آپ کی تصانیف نے اردو کے خزانے میں بیش قیمت اضافے کیے ہیں۔ کسی انسان میں اتنے اوصاف کا اکٹھا ہو جانا فیضانِ الٰہی ہے۔ جگر کا ایک مصرعہ اس کی ترجمانی کرتا ہے:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

آپ کی کچھ کتابیں نظر نواز ہوئی ہیں اور آپ کی تحریر سے میں بہت متاثر ہوں۔ میں اپنے کاموں کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن صرف اس خیال سے کہ میں نے آپ کی کتاب کی قیمت ادا کرنے میں بخل کیا ہے اردو کی خدمت کے سلسلے میں چند باتیں تحریر کر رہا ہوں۔

اردو زبانہ طالب علمی سے میرا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔ میرا ذاتی کتب خانہ میرے لیے سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اردو کے بیس پچیس رسالے، ہفتہ روزہ اور روزنامے منگاتا ہوں۔ میں مسلم کالج کا بیس سال سے صدر ہوں جس میں درجہ یکم سے لے کر ایم۔ اے تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں پر درجہ پنجم تک میں نے اردو کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ اپنے والد صاحب کے نام پر میں نے سید ساجد علی میموریل کمیٹی قائم کی ہے جو ہر سال یہاں ہر اسکول کالج اور یونیورسٹی میں فائنل درجات میں اول اور دوم آنے والے طلبا کو انعام اور توصیفی سند دیتی ہے۔ غیر مستطیع طلبا کو اردو کی کتاب اور کاپیاں مہیا کرتی ہے اور ان کی فیس ادا کرتی ہے۔ اللہ کی عنایات، میں تمام اخراجات کا کفیل خود ہوں۔

ملک زادہ منظور احمد نے اپنے ماہنامہ 'امکان' (لکھنؤ) کے مئی ۲۰۰۴ء کے شمارے میں میرے بارے میں لکھا ہے آپ کی نظر سے شاید گزرا ہو۔

آپ اردو کے ایک کامیاب استاد اور مانے ہوئے دانشور ہیں میری حیثیت اردو کے ایک طالب علم سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے اپنے سے بلند شخصیت کی تحریر پر تبصرہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ پہاڑ کی چوٹی دیکھنے کی کوشش کرنے والے کی ٹوپی سر سے گر

جاتی ہے لیکن آپ نے کتاب پر تحریر کیا ہے مطالعہ کے لیے۔ لہٰذا صرف تعمیل حکم کی خاطر چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔ مجھے اپنی کم علمی اور بے مائیگی کا اعتراف ہے۔ پتہ نہیں کیا لکھ گیا۔ آنکھ کے ساتھ نہ دینے کے سبب کاٹ پیٹ بھی ہوگئی ہے۔ آج کل گھر میں بیماری کے سبب دماغ بھی منتشر رہتا ہے، اس لیے میری تحریر میں فروگزاشت ہونا لازمی ہے، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ عمر طویل عطا کرے اور آپ کو اردو کی خدمت کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دے۔ کیوں کہ:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

نیاز مند

محمد حامد علی

☆☆

'میں اردو ہوں'

تبصرے

(۱)

'جامعہ''، دہلی (اپریل مئی جون ۲۰۰۶ء)

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور علمی ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اردو کے سچے عاشق ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی، تحفظ، ترویج و اشاعت اور اس کے متعلق مسائل کے تئیں وہ ہمیشہ فکرمند اور سرگرمِ عمل رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''میں اردو ہوں'' دراصل اردو زبان کے مسائل سے متعلق لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اردو کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے اور اردو کی خدمت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ان مضامین سے متعلق دسنوی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''یہ مضامین اس جذبے سے لکھے گئے تھے کہ اہلِ اردو اپنی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھیں، اس کی خدمت سے باخبر رہیں... اس کے لیے اس کے وطن میں باعزت زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کریں''۔

اس کتاب میں دسنوی صاحب کے مضامین کے علاوہ اردو زبان سے متعلق مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد اور فراق گورکھپوری کے خیالات اور نظریات بھی شامل ہیں۔

اردو زبان و ادب سے عام بے توجہی کے اس دور میں یہ کتاب ایک ادبی تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر اختر الواسع

(۲)

ہماری زبان، دہلی (۲۲ ر تا ۲۸ ر اگست ۲۰۰۶ء)

آزاد ہندوستان میں اردو کا مسئلہ کئی لحاظ سے خاصا اہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ یہ ہندوستان کا المیہ ہے کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں زبانوں کی سیاست کا بول بالا ہے اور اس کا نتیجہ اردو کو بھگتنا پڑا۔ اس طرح اردو کے مسائل کا مطالعہ پورے ہندوستانی طرزِ فکر کا مطالعہ اور اس کے لیے انتہائی معروضی اور سائنسی طریقہ کار کی ضرورت ہے جس کا احساس بد قسمتی سے عام نہیں ہے اور ہم اردو کے مسائلہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر جذباتی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف عبدالقوی دسنوی اردو کے سینئر ناقد ہیں۔ وہ مشہور بھی ہیں اور معروف بھی۔ اگرچہ انھوں نے اپنی زندگی بھوپال میں گزاری لیکن برصغیر ہند و پاک میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ''میں اردو ہوں'' ان چھوٹے چھوٹے ۳۳ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اگرچہ مختصر اور تاثراتی قسم کے ہیں لیکن ان سے آزاد ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل کا اندازہ بخوبی ممکن ہے۔ ان مضامین کی ایک خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ اردو کے ایک برگزیدہ ادیب کے ردِ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اردو کے ساتھ حکومت کے سوتیلے رویے، اہلِ اردو کی بے حسی اور اردو رسم خط جیسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین ''ہماری زبان'' میں شائع ہوئے ہیں اور تقریباً ہر مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم کا حوالہ ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اردو کے مسائل کی نشاندہی اور حل کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون ہے ''کچھ اردو کے بارے میں قدردانِ اردو کے خیالات'' اس میں مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو اور پروفیسر شمیم حنفی وغیرہ جیسے اسکالرز کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

مبصر: جاوید رحمانی

(۳)

''کتاب نما'' (ستمبر ۲۰۰۶ء)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، حیدرآباد

اس وقت اردو زبان کے معماروں اور خدمت گزاروں کا کوئی تذکرہ عبدالقوی دسنوی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ان کا تعلق سید سلیمان ندوی، نجیب اشرف ندوی اور شہاب الدین دسنوی کے وطن دسنہ (بہار) سے ہے، لیکن انھوں نے بھوپال کو اب مستقل اپنی اقامت گاہ بنا لیا ہے۔ وہ سیفیہ کالج بھوپال میں بہت ہر دلعزیز استاد رہ چکے ہیں۔ بہت سے پھولوں کے قلم وطن سے باہر چمن میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یہ نیا چمن وہ چمن ہے جس میں کیف بھوپالی، شعری بھوپالی، تاج بھوپالی، تخلص بھوپالی، قاضی وجدی الحسینی، محمود الحسینی، مولانا عمران خاں، شاکر علی خاں، نواب صدیق حسن خاں جیسے خدمت علم و ادب کے پھول کھلتے رہے ہیں۔ جناب عبدالقوی دسنوی اردو والوں کو اردو کے حالات سے آگاہ کرنے اور اردو کی باعزت زندگی کی راہ ہموار کرنے کی برابر کوشش کر رہے ہیں۔

عبدالقوی دسنوی نے اپنی تازہ کتاب کا نام ''میں اردو ہوں'' رکھا ہے۔ انھوں نے بہت سی دستاویزی چیزیں اس میں جمع کر دی ہیں جیسے مہاتما گاندھی کا لوگوں کو نصیحت کرنا کہ وہ اردو لپی (رسم خط) سیکھیں۔ انھوں نے جواہر لال نہرو کا ان کی کتاب ''میری کہانی'' سے اقتباس نقل کیا ہے کہ ہندوستانی زبان کے دونوں رسم خط فارسی اور دیوناگری کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اردو کے سلسلے میں مولانا آزاد کی وہ تقریر نقل کردی ہے جو انھوں نے ۱۹۵۸ء میں دہلی کی اردو کانفرنس میں کی تھی۔ مولانا آزاد خود ایک دور افتادہ صدا محسوس کرنے لگے تھے۔ انھیں غم تھا کہ مسلمانوں نے ان کی بات نہیں مانی۔ فراق گورکھپوری کی آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی جس میں انھوں نے ہندی کے ادیبوں کو اردو ادب سے استفادہ کی تلقین کی تھی اور اسے ہندی کی مہلک بیماری کا واحد علاج قرار دیا تھا۔ فراق گورکھپوری کا یہ اقتباس بہت اہم اور چشم کشا ہے۔ اردو محبت کی زبان ہے۔ اتحاد و اتفاق کی زبان ہے۔ وطن دوستی کی زبان ہے۔ اس میں ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں،

تہذیبی استعاروں کا تذکرہ ہے۔ یہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس زبان کی خدمت میں غیر مسلموں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ بہت سے مسلم ادبا اور شعرا کے شاگرد غیر مسلم رہے ہیں۔ مرزا مظہر جاناں جاں کے شاگرد کشن چند مجروح تھے۔ میر تقی میر کے شاگرد جسونت سنگھ دیوانہ تھے۔ آتش کے دیا شنکر نسیم شاگرد تھے اور انشا کے مکھن لال وغیرہ۔ بعد میں بھی تلوک چند محروم، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، فراق گورکھپوری، پریم چند، سدرشن اور کرشن چندر اور بیدی وغیرہ۔ بہت سے غیر مسلم ہوئے جن کی خدمات اردو کے لیے کسی مسلمان سے کم نہیں۔ مشرب عشق میں شیخ و برہمن یکساں ہیں اور سبحہ و زنار دونوں اس کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ دونوں نے وطن کی محبت کے گیت گائے ہیں۔ دونوں نے شاداب کھیتوں اور لہلہاتے ہوئے مرغزاروں سے اپنی وارفتگی کا اظہار کیا ہے۔ دونوں نے مل کر غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے اور آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور خاکِ وطن کو ملک سلیمان سے خوشتر اور خارِ وطن کو سنبل و ریحان سے بہتر قرار دیا ہے۔ دونوں نے مل کر سیاسی بیداری کا صور پھونکا ہے۔ اہل اردو اور مسلمانوں کی رواداری اور ان کے صلح کل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اردو زبان میں ہندو مذہب اور ملک کے دیگر مذہب کے بارے میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جب کہ دوسری زبانوں میں اسلام کے بارے میں اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ہے۔ لیکن افسوس کہ اس ملک میں پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا گیا ہے اور بے غرض دستوں کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا گیا ہے۔ یہی فرقہ پرستی ہے جس نے سہ لسانی فارمولہ کو ناکام کر دیا۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو سرد خانہ میں ڈال دیا۔ اردو جو اپنے حقوق سے محروم رہی، اس کی وجہ یہی فرقہ پرستی ہے۔ لیکن اہلِ اردو کو بھی چاہیے کہ ماحول کو سازگار بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں۔ صاف اور شریف ذہن کے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر اردو کی لڑائی لڑیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ نئی نسل کو اردو سکھائیں۔ اردو کی محبت کا بیج ان کے دلوں میں بوئیں۔ اردو اخبار اور اردو کتابیں خریدیں۔ تقریبات کے دعوت نامے اردو میں شائع کریں۔ مجھے حیرت ہوئی جب ایک تعلیم یافتہ خاتون نے فرمایا "میں اردو اخبار انٹرنیٹ پر پڑھ لیتی ہوں۔ مجھے اردو اخبار خریدنے کی ضرورت نہیں"۔ ہندی والوں نے مسلمانوں کے طویل عہد حکومت میں اپنی

زبان ہندی کی حفاظت کی۔ اب اگر اردو والے محض اس خوف سے کہ اردو پڑھنے سے ملازمت نہیں ملے گی، اردو نہ سیکھیں اور اردو کی حفاظت نہ کریں تو اردو والوں سے زیادہ غیرت مند تو ہندی کے لوگ ٹھہرے کہ انھوں نے ناسازگار حالات میں اپنی زبان کی حفاظت کی تھی۔ اس وقت اگر جمہوریت اور سیکولرازم کے زمانے میں اردو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہے تو یہ ناانصافی کی بات ہے اور یہ بڑی بے توفیقی کی بات ہوگی کہ اہلِ اردو بھی اردو سرپرستی نہ کریں اور اس سے اپنا دامن بچاتے پھریں۔ جو لوگ اپنی مادری زبان کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں، وہ پھر کسی کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ میں تو ایسے اردو والوں کو ہی دوسروں سے پہلے اردو کا قاتل سمجھتا ہوں اور انھیں خود اپنے آپ کو اردو کا قاتل سمجھنا چاہیے۔ فرقہ وارانہ جذبات کا بیج انگریزوں نے بویا تھا، جس کی وجہ سے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا گیا اور اس کو پھلنے پھولنے سے روکا گیا۔ اس کے جسم کو لہولہان کیا گیا۔ اردو والوں نے کبھی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مذہبی تعصب کی دیواریں ایک نہ ایک دن گریں گی، لیکن اردو والوں کو چاہیے کہ اردو کی حفاظت کریں اور اپنے گھروں میں اردو سیکھنے اور سکھانے کا انتظام کریں۔ میں جب ایسے خاندانوں کو دیکھتا ہوں جہاں والدین کو تو اردو آتی ہے لیکن لڑکوں کو نہیں آتی تو مجھے والدین مجرم معلوم ہوتے ہیں۔ ہم الزام ان کو (حکومت کو) دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔ اس لیے کہ والدین نے اپنی وراثت اپنے لڑکوں کی طرف منتقل نہیں کی۔ تہذیبی اور لسانی وراثت کا منتقل کرنا مال و دولت کی وراثت منتقل کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ انسانی زندگی ثروت سے کہیں زیادہ تہذیب سے عبارت ہے۔ زندگی گزارنے کا راتب تو جانوروں کو بھی مل جاتا ہے۔ انسان کی تگ و دو اگر صرف راتب تک محدود رہے تو انسان اور جانور میں کچھ بھی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی محبت کا چراغ اب بجھ رہا ہے۔ اردو کے اخبار نہیں پڑھے جاتے۔ اردو کی کتابیں نہیں خریدی جاتیں ہیں۔ بچوں کی اردو تعلیم کا نظم نہیں کیا جاتا ہے۔ روزنامہ سیاست کے ذمہ داروں نے بہت کوششیں کی ہیں اور بادِ مخالف میں اردو کا چراغ روشن رکھنے کی تحریک چلائی ہے، لیکن یہ تحریک پورے ہندوستان کی تحریک نہیں بن سکی ہے۔ اتر پردیش میں مسلم یونیورسٹی کے مسلم طلبا اپنے والدین کو ہندی میں خط لکھتے ہیں۔ اس

صورتِ حال میں ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام بہت ہمت افزا ہے لیکن یونیورسٹی کو اس قدر ترقی دینا چاہیے کہ انجینئرنگ اور ڈاکٹری وغیرہ کی تعلیم بھی بہ زبانِ اردو ہو سکے۔ اردو زبان میں یقیناً یہ صلاحیت موجود ہے۔

محترم عبدالقوی دسنوی صاحب نے کتاب میں اردو کی تعلیم اور تہذیب کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھیں خداوندانِ مکتب سے شکایت ہے۔ اردو کے اساتذہ اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے اور علمی کاموں سے گریز کرتے ہیں۔ ریسرچ اور تحقیق کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ تعلقات کی سیاست کے زور پر ان کا تقرر ہو جاتا ہے۔ پھر ریڈر اور پروفیسر بھی ہو جاتے ہیں اور بہت سے پڑھنے لکھنے والوں اور علمی کاموں میں منہمک رہنے والوں کو کوئی ترقی نہیں ملتی۔ انٹرویوز منصفانہ نہیں ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انٹرویو میں صلاحیت کے اظہار کی بنیاد پر فیصلے نہیں ہوتے بلکہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں اور اس میں اقربا پروری اور علاقائی عصبتیں اور دوستانہ تعلقات کام کرتے ہیں۔

اردو کے سلسلے میں ہمارے مطالبات جو حکومت سے ہیں، وہ جاری رہیں گے۔ اہلِ اردو رسم خط کو کبھی تبدیل نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اردو کے مسئلے کو الیکشن ایشو بھی بنائیں گے۔ لیکن اہلِ اردو کی اپنی بھی تو کوئی ذمہ داری ہے۔ بچوں کو اردو سکھانا، اردو اخبار خریدنا، اردو کتابیں خرید کر پڑھنا یہ عادتیں تو اردو والوں کو اختیار کرنی ہوں گی۔ آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دوسری زبانوں کے اہلِ قلم کی مالی حالت بہت بہتر ہوتی ہے وہ خوشحال ہوتا ہے۔ لیکن اردو کا ادیب اور شاعر مفلس اور بدحال ہوتا ہے۔

اردو زبان کے اہلِ علم، اہلِ قلم اور ادبا اور شعرا کی کسمپرسی محتاج تفصیل نہیں۔ وہ سب کے سب "صورت ببیں حالت مپرس" کے مصداق ہیں اور جن کی حالت بہتر ہے وہ ان کی اردو دانی اور ادب دانی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کسی اور میدان میں ان کے ہنر اور کمال کی وجہ سے ہے۔ اہلِ قلم کی ناقدری اس لیے ہے کہ اب لوگ کتاب پڑھنا اور دماغ سوزی کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

کرکٹ ٹورنامنٹ اور میچ لوگ گھنٹوں ٹی وی پر دیکھتے ہیں اور روز دیکھتے ہیں۔ کھیلنے کا

فلسفہ تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن کھیل دیکھنے کا فلسفہ کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ میچ کوئی اور جیت جاتا ہے خوشی کسی اور کو ہو جاتی ہے اور اتنی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ جیسے خود اس نے ملک فتح کرلیا ہو۔ پہلے لوگ کہا کرتے تھے ''پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے نواب اور کھیلو گے کودو گے تو ہو گے خراب'' لیکن معاملہ برعکس ہو گیا ہے۔ کھیلنے کودنے سے آدمی نواب (منصور خاں پٹودی) بن جاتا ہے۔ کھیلنے کودنے میں نام پیدا کرنے سے صرف ۲۲ سال کی عمر میں پدم شری مل سکتا ہے جیسے ثانیہ مرزا کو مل گیا۔ ثانیہ مرزا صرف اشتہارات سے سال میں نو کروڑ روپے کما لیتی ہیں۔ بیچارے اردو کے مصنفین اپنی کتابوں کے مسودے لیے گھومتے رہتے ہیں کوئی ناشر نہیں ملتا۔ ناشر اپنا سرمایہ اس لیے نہیں لگاتا ہے کہ چھپنے کے بعد کوئی کتاب خریدے گا نہیں۔ ہم ایک بہت پڑھے لکھے فاضل ادیب سے واقف ہیں جو اپنی ایک ہزار صفحے کی کتاب کا مسودہ لیے ہوئے پچھلے دس برس سے گھوم رہے ہیں۔ کوئی ان کی کتاب چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اگر آپ قلم کے بجائے ہاکی پکڑ لیں یا کرکٹ کا بیٹ اٹھا لیں تو آپ کا مستقبل زیادہ روشن ہو جائے گا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

جناب عبدالقوی دسنوی نے اردو کی ترویج اور بقا کے لیے جو قیمتی مشورے دیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ گھروں میں اردو کا ماحول پیدا کیا جائے۔

۲۔ بچوں کو اردو پڑھائی جائے اور اردو کی محبت دلوں میں پیدا کی جائے۔

۳۔ اردو کے مکتب اور اسکول قائم کیے جائیں۔

۴۔ گھروں میں اردو رسائل اور اخبارات منگائے جائیں۔

۵۔ اپنے اپنے علاقے میں دارالمطالعہ اور کتب خانہ قائم کیا جائے۔

۶۔ ادبی نشستوں اور مشاعروں کا اہتمام کیا جائے۔

۷۔ بچوں میں بیت بازی کا شوق پیدا کیا جائے۔

۸۔ شاعروں اور نثر نگاروں کی قدر کی جائے۔ اردو اکادمیوں کو زیادہ مفید بنایا جائے۔

۹۔ حکومت سے حق مانگنے میں پیچھے نہیں رہا جائے اور یہ کام مسلسل کیا جائے۔

(۴)

فنکار، گوالیر (ستمبر ۲۰۰۶ء)

اردو محبت کی زبان ہے۔ اردو مساوات کی زبان ہے، اردو میل ملاپ کی زبان ہے، اردو وطن دوستی کی زبان ہے، اردو آدمیت کے احترام کی زبان ہے، انھیں موضوعات پر ایک کامیاب کتاب منظر عام پر آئی ہے ''میں اردو ہوں'' جس کے مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ادبی دنیا میں جن کی شخصیت تابندہ ہے، ان کا اسم گرامی ہے ''عبدالقوی دسنوی''۔

ملک اور بیرونِ ملک کے اردو رسائل اور اخبارات میں آئے دن جن کی نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے یہ واضح ہے کہ ان میں اردو کی خدمت کا جذبہ قوی ہے۔ اردو کاز کے لیے ان کے مضامین مشعلِ راہ ہیں۔ اکثر میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں تو میں نے ان کے اندر اردو دوستی اور اردو خدمت کے جذبہ کو تازہ دم پایا ہے۔ ان کے الفاظ میں اردو کی زبوں حالی کا درد ہے اور ان میں اردو کو نظر انداز کیے جانے کے خلاف احتجاج بھی۔

اس کتاب کے سرورق پر ایک جملہ نمایاں ہے ''اردو کی تمنا عظیم ہندوستان کی ہے'' یہ جملہ سرخ رنگ میں ہے گویا اردو نے اپنے لہو سے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا ہے۔ سچ بھی ہے کہ جیالوں نے جنگ آزادی میں اپنا لہو نچھاور کیا ہے۔ اردو شاعری نے، اردو نثر نے، اردو تقاریر نے ہندوستانیوں میں جوش، محبت، حوصلے اور وفا کو منزل بہ منزل جلادی ہے۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا ہے۔ اردو ہی کی پکار ہے جو کتاب کے سرِ ورق پر اجاگر ہے۔

''ہندو مسلم سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی''

''میں اردو ہوں'' کتاب میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، فراق گورکھپوری اور بھی کئی اہم دانشور ہستیوں کے پیغام تقریر و تحریر کے اقتباسات ہیں جن سے اردو کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

عبد القوی دسنوی فرماتے ہیں:

''ہم اردو زبان کی اہمیت کو سمجھیں اردو کی خدمات سے باخبر رہیں، اردو کے حالات سے آگاہ ہوں، اردو ہندوستان کے ہر حصے میں محبت کے نغمے الاپتی رہے، نفرت کے خلاف آواز اٹھاتی رہے اور ہر قسم کی برائیوں سے آگاہ کرتی رہے''۔

سچ ہے اردو زبان میں ہی دلوں کو متوجہ کرنے کا خوش فضا انداز بدرجہ اتم موجود ہے۔
''میں اردو ہوں'' یہ کتاب اردو زبان کے تعلق سے اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اہلِ اردو کے لیے ضروری ہے۔

اپنے ایک مضمون میں عبد القوی دسنوی بہ زبانِ اردو تحریر فرماتے ہیں:

''اہلِ اردو اگر میری ان باتوں کی طرف توجہ دیں گے اور واقعی مجھ پر یعنی اپنی مادری زبان سے محبت کا عملی ثبوت پیش کریں گے اور مادری زبان کی ترقی کے لیے سچے دل سے عہد کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ پھر لوگوں کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوگا''

''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے''

میں اردو ہوں کتاب میں زیادہ تر ہماری زبان دہلی میں شائع شدہ مضامین ہیں، علاوہ اس کے آبشار کلکتہ، کتاب نما، دہلی جامعات ہند، راشٹریہ سہارا دہلی، جہانِ اردو دربھنگہ، صدائے اردو بھوپال، اردو ایکشن بھوپال، دورِ حیات ممبئی میں اشاعت پا چکے ہیں یعنی یہ کہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تحریرات کو یکجا کر دیا گیا ہے تا کہ اہلِ اردو کے لیے ان کا مطالعہ آسان ہو۔

کتاب میں اگر کوئی کمی ہے تو یہ کہ کسی صفحہ پر یا آخری صفحہ پر مصنف کی سوانح اور تصویر کو شائع نہیں کیا گیا ہے جو نئی نسل اور آنے والی نسلوں کی معلومات کے لیے ضروری تھا۔

خوبصورت گیٹ اپ میں جاذب سرِ ورق کے ساتھ بہترین کاغذ پر بہتر طباعت میں ۱۵۰ صفحات کی اس کتاب کی قیمت کے آگے درج ہے:

"اردو سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترامِ آدمیت"...بس...
یہ قیمت اگر آپ کو دینا منظور ہو تو رابطہ قائم کریں۔

مبصر: قمر برتر

(۵)

قومی تنظیم، پٹنہ (۱۱ر نومبر ۲۰۰۶ء)

برصغیر کے مشہور و معروف ادیب و ناقد پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال) اپنی نگارشات اور تخلیقات کے سبب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اردو کے مسائل پر ان کی تحریریں راقم السطور گزشتہ دو دہائیوں سے ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی میں پڑھتا آرہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پروفیسر دسنوی کی ان تحریروں سے نہ صرف میں متاثر ہوا بلکہ ان کی تحریروں کے سبب خدمت اردو کی تحریک بھی ملی۔ ہماری زبان کے ان تمام شماروں کو میں نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا۔ جن میں اردو کے مسائل پر مختلف ادیبوں اور دانشوروں کی تحریریں چھپی تھیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بے حد احتیاط کے باوجود پتہ نہیں کس طرح دیمک کی پہنچ میری الماری تک ہوگئی اور ساری چیزیں ضائع ہوگئیں۔ خاص طور پر وفیسر عبدالمغنی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تحریریں ضائع ہوجانے کا زیادہ افسوس ہوا۔ گزشتہ جولائی ماہ میں ڈاک مجھے ارسال کیا جس میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تازہ تصنیف "میں اردو ہوں" بھی شامل تھی۔ کتاب دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ پروفیسر دسنوی کے وہ سارے مضامین جو "ہماری زبان" میں شائع شدہ تھے وہ ان کی اس تازہ تصنیف میں شامل ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ اور بھی ان کے کئی عمدہ مضامین اس کتاب میں دیکھنے کو ملے۔ یہ کتاب کیا ہے اردو کا عاشق بنانے کی ایک کاوش۔ اس کتاب کے مضامین کے ذریعہ اردو والوں کو ان کی مادری زبان کی اہمیت بتانے اور اردو سے محبت پیدا کرنے کی ایک قابلِ تحسین کوشش کی گئی ہے، جسے پڑھ کر مصنف کے دل کی دھڑکنوں کا بخوبی اندازہ لگتا ہے۔ پروفیسر عبدالقوی کی یہ تمنا ہے کہ اہلِ اردو اپنی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھیں، اس کی خدمات سے باخبر رہیں، اس کے ماضی اور حال سے آگاہ رہیں اور اس کے مستقبل کی فکر کریں ایسے ہی جذبات اور آزادی کے سبب پروفیسر دسنوی کے دل و

دماغ میں ہلچل پیدا ہوگئی اور مضامین قلمبند ہوتے چلے گئے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی زندگی میں اردو کس قدر رچی بسی ہوئی ہے اس کا اندازہ زیر تذکرہ کتاب ''میں اردو ہوں'' کا سرورق دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کتاب کے سرورق پر جو جملے تحریر ہیں وہ اس طرح ہیں ''اردو محبت کی زبان ہے''، ''اردو مساوات کی زبان ہے''، ''اردو کی پکار ہے: ہندو مسلم سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی''، ''اردو کا نعرہ ہے: دھرتی کے باسیوں کی مکتی پربت میں ہے''۔ مزید دو جملے سرخ رنگ سے تحریر ہیں وہ اس طرح ہیں ''اردو کی تمنا عظیم ترین ہندوستان کی ہے''، ''اردو احترامِ آدمیت کی زبان ہے'' ان سرخ تحریروں کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اردو کی یہ دو تمنائیں اردو کو خون کے آنسو رلا رہی ہیں کیوں کہ اس کی یہ تمنائیں اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکیں۔ نہ ہندوستان صحیح معنوں میں ابھی تک عظیم ترین ہوسکا ہے نہ ابھی تک یہاں احترامِ آدمیت کا شعور پیدا ہوسکا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے جذبہ خدمت اردو کی داد دینی ہوگی کہ انھوں نے ۱۵۰ صفحات کی اپنی اس کتاب کی قیمت بظاہر کچھ بھی نہیں رکھی لیکن کتاب پر جو قیمت درج ہے ''مادری زبان اردو سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترامِ آدمیت''۔

یہ قیمت چکانے کا جو حوصلہ رکھتے ہیں وہ کتاب کے لیے پروفیسر صاحب سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل کو اجاگر کرتی ہوئی یہ کتاب ''میں اردو ہوں'' ۳۳ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں اردو سے متعلق ایک مختصر تحریر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک یادگار اور ان کی آخری تقریر کا اقتباس بھی اس میں شامل کیا گیا ہے جسے انھوں نے ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو اردو کانفرنس منعقدہ پریڈ گراؤنڈ دہلی میں کیا تھا۔ اردو کی اہمیت ظاہر کرنے والی ایک تحریر فراق گورکھپوری کی بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں ''کچھ اردو کے بارے میں قدردانِ اردو کے خیالات'' کے عنوان سے مولوی عبدالحق، سرتج بہادر سپرو، حبیب ریحان ندوی ازہری، ڈاکٹر ابو محمد سحر، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نصیر احمد خاں اور منوہر راج سکسینہ وغیرہ مشاہیر علم و ادب کے اردو کے سلسلہ میں قیمتی آرا نقل کیے گئے ہیں۔ خود پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ان میں ''میں اردو ہوں''

،''کچھ اردو کے بارے میں''، ''قصہ اردو کی بے بسی کا''، ''اردو پر عجب وقت پڑا ہے''، ''قصہ پھر حکومت، اردو اور اردو والوں کا''، ''بات اردو اور اردو رسم الخط کی''، ''اردو اور نئی نسل''، ''اردو کتب رسائل و اخبارات کی اشاعت اور اردو معاشرے...''، ''اردو محبت کی طلبگار ہے'' اور ''اردو کا مستقبل ہندوستان میں'' بے حد اہم اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ یہاں ان مضامین کے اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ قاری کی براہِ راست پہنچ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے جذبات و احساسات تک ہو سکے اور قاری کے اندر بھی اردو دوستی اور اردو کی خدمت کا جذبہ موجزن ہو سکے۔

> ''اردو کو مٹنے سے بچانے کے لیے محبوبہ کا درجہ نہیں مادری زبان کے رشتے سے ماں کا درجہ دینا ہوگا۔ لیکن بد نصیبی یہ ہے کہ عام طور سے اردو کو اپنی کنیز کا درجہ دیتے ہیں اور اس سے اپنی خدمت لیتے ہیں اپنی شہرت اور عزت کا اسے ذریعہ بناتے ہیں۔ اس کے ہر انعام اور اعزاز کا صرف اپنے کو مستحق سمجھتے ہیں لیکن اردو کی خدمت کرنا دوسروں کا فرض جانتے ہیں۔ انھیں میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں کہ اردو پڑھ کر کیا کریں گے''۔

(ماخوذ 'قصہ اردو کی بے بسی کا'، ص: ۴۲)

> ''اردو کے مخلصین وہ حضرات ہیں جن کے گھروں میں اردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ وہ اردو اخبارات، رسائل اور کتابیں بھی خریدتے رہتے ہیں اور اپنے نہیں اردو کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں۔ یہی مخلصین نہایت دردمندی کے ساتھ اخبارات اور رسائل میں اپنے خیالات اور تجربات کا اظہار کرتے ہیں تا کہ اردو کے بہی خواہ اردو کے حالات سے باخبر رہیں''۔

(ماخوذ: 'قصہ پھر حکومت، اردو اور اردو والوں کا'، ص: ۵۳)

> ''ان حالات میں اردو کے شیدائیوں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ اردو کو اپنے گھروں میں زندہ رکھیں اور اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم ہر قیمت پر دیں یعنی اگر اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہ ہو تو گھر پر پڑھائیں اور گھر میں اس

کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔ جب اردو اپنے گھر میں عزت کے ساتھ رہے گی تو پھر دوسرے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکیں گے اور حکومت بھی اس کا حق دینے پر مجبور ہوگی۔

ورنہ اگر صرف حکومت پر بھروسہ کیا جائے گا تو وہ اپنے مفاد کے سامنے اردو کے لیے کبھی کچھ نہیں کرے گی۔ تاوقتیکہ اس کا مفاد اردو سے وابستہ نہ ہو جائے اور اس کا مفاد اردو سے وابستہ اس وقت ہوگا جب کروڑوں اردو کو مادری زبان کہنے والے اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں گے"۔

(ماخوذ: 'بات اردو اور اردو رسم خط کی'۔ ص: ۶۵)

"نئی نسل کے وہ افراد جو اردو سے ناواقف ہیں اور اپنی مادری زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں سمجھتے اس میں ان کا قصور نہیں ہے قصور ان کے والدین کا ہے جنھوں نے اپنے بچوں سے ان کی مادری زبان چھین لی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ مادری زبان کی کیا اہمیت ہے اور بچوں کی ذہنی تعمیر میں مادری زبان کیا کردار ادا کرتی ہے۔

ابھی تو اردو کے کچھ گھروں میں ہی نئی نسل اردو سے بے تعلق ہوتی جارہی ہے اگر ہم اس طرف متوجہ نہ ہوں گے تو آنے والی نسل میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو اردو سے ناآشنا رہے گی اور ہماری بے توجہی سے ان میں اضافہ ہوتا رہے گا"۔

(ماخوذ "اردو اور نئی نسل" ص: ۸۱۔ ۸۲)

"بچوں میں مادری زبان سے دلچسپی پیدا کرنے میں گھر کے ماحول اور والدین کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ آزادی سے قبل اہلِ اردو کے گھروں میں بچہ پہلے اردو بولتا تھا، اردو پڑھتا تھا، اردو میں کہانیاں سنتا تھا، اردو میں کھیل کھیلتا تھا، اردو کے اشعار یاد کرتا تھا خود میں نے بچپن میں پہلی نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یاد کرلی تھی۔ پہلا رسالہ "پیام تعلیم" میری نظر سے اس لیے گزرا تھا کہ والدین نے جاری کروایا تھا اسی کے ساتھ انھوں نے بچوں کی

چھوٹی چھوٹی مفید کتابیں لا کر دی تھیں، جس کی وجہ سے پڑھنے کا شوق تیز تر ہوتا گیا۔

آج یہ ضروری ہے کہ اہلِ اردو اپنے بچوں میں اردو پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے بچوں کے رسالے اور کتابیں ضرور مہیا کریں، ہلکی پھلکی نظمیں یاد کرائیں، دلچسپ کہانیاں سنائیں، دلچسپ باتیں کریں''۔

(ماخوذ 'اردو کتب، رسائل واخبارات کی اشاعت اور اردو معاشرے کی ذمہ داریاں'۔ ص: ۸۵)

بلاشبہ یہ کتاب اردو زبان کے تعلق سے بے حد اہم اور کارآمد ہے۔ اس کا مطالعہ تمام اہلِ اردو کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ کتاب میں شامل تمام مضامین اردو والوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(مبصر: انوار الحسن وسطوی)

(۶)

ہندوستانی زبان، ممبئی (اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ء)

سب میرے چاہنے والے ہیں میرا کوئی نہیں

یہی ''زاری'' کرتی ہے عبدالقوی دسنوی کی کتاب ''میں اردو ہوں''۔

یہ کتاب اردو کی وہ کہانی سناتی ہے جو بہتوں نے بہت بار سنائی۔ اس میں ایک فریاد کے ساتھ وہ دعوے بھی ہیں جو دعوے صرف اردو زبان ہی خم ٹھونک کے کر سکتی ہے۔ دوسری کوئی ہندوستانی زبان نہیں۔

کتاب کے جاذب نظر سرورق پہ لکھی عبارتیں نعرے نہیں تاریخ ہیں۔ مثلاً:

اردو کی تمنا عظیم ہندوستان کی تمنا ہے۔

اردو محبت کی زبان ہے۔

اردو احترامِ آدمیت کی زبان ہے۔

اردو جنگِ آزادی کی زبان ہے۔ وغیرہ۔

اور سب سے اہم 'میں اردو ہوں (گنگا جمنی تہذیب کی امین)'

عبدالقوی دسنوی صاحب اردو کے جاںنثاروں میں ہیں، انھوں نے اردو کی عظمت کا

قصیدہ بھی پڑھا ہے اور موجودہ صورتِ حال پر مرثیہ بھی۔ یہ کتاب ان کے لکھے ان مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اردو اخباروں (خاص طور پر 'ہماری زبان' دہلی) میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے اردو کی بقاء کے لیے راستے بھی دکھائے ہیں لیکن تقریباً ہر مضمون میں ایک سی ہی باتیں دہرائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ جب حال ایک سا ہی ہو تو جذبہ بھی وہی رہتا ہے اور باتیں بار بار دہرانے سے ان کے خلوص پر حرف نہیں آتا۔

اردو کے سلسلے میں ان کے مشورے یہ سوچنے پر اکساتے ہیں کہ آج اردو کے سامنے جو مسائل اور اس کی راہ میں جو روڑے ہیں ان سے فی زمانہ عملی طور پر کیسے نپٹا جائے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے راستہ کیسے ہموار کیا جائے۔

کتاب کے شروع میں انھوں نے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور فراق وغیرہ کے خیالات اردو کے بارے میں پیش کر کے اردو کی سیکولر شکل دکھائی ہے، مختلف اشعار سے بھی مدد لی گئی ہے اور اپنی بات میں وزن پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے لکھے مضامین میں اردو کی اہمیت، اس کے نام پر استحصال اور اردو والوں کی بے حسی مختلف طریقوں سے، کبھی حالات سے، کبھی واقعات سے اور کبھی دوسروں کے بیانات اور خیالات سے نمایاں ہے۔ کتاب کے اہم مضامین میں 'قصہ اردو کی بے بسی کا'، 'بات اردو اور اردو رسم الخط کی'، 'اردو اور نئی نسل'، 'شاید کے ترے دل میں اتر جائے مری بات'، 'اردو کا مستقبل ہندوستان میں'۔

ان کے علاوہ جتنے بھی مضامین ہیں سب میں اردو کے لیے ان کا بے لوث خلوص، لگاؤ اور بے چین جذبہ، صاف ظاہر ہوتا ہے لیکن ایک نکتہ جو مجھے کہیں نظر نہیں آیا اور جو دسنوی صاحب کی نظر سے بھی اوجھل رہا وہ ہے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کا ذکر۔ آج وقت کا تقاضا یہی ہے کہ دلوں سے یہ غلط فہمی دور کی جائے کہ اردو پڑھ کر، کمائی کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ دسنوی صاحب کو تفصیلی طور پر اس بارے میں ایک مضمون لکھنا چاہیے تھا کیوں کہ اب روزی کے لیے نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ اردو مدرس کی قابلیت، لیاقت اور اردو کے لیے ان کی نیت کیا ہے، اس کی طرف اشارہ ہی نہیں بہت واضح طور پر

انھوں نے ایسے نااہل اردو ماسٹروں، لیکچراروں اور مفاد پرستوں کو بے نقاب کیا ہے، اس لیے اردو والے اب صرف مدرس بن کر ہی نہیں گزر بسر کرنا چاہیں گے۔ اردو سے مستفیض ہونے والے دوسرے موقع پرستوں کا ذکرِ خیر بھی ہے۔

ایک بات اور... دسنوی صاحب ممبئ کے پڑھے ہوئے ہیں، یہاں اردو کی صورتِ حال دوسرے صوبوں سے کافی بہتر ہے اور خاص کر اردو تعلیم کے مواقع انگریزی اور مراٹھی زبانوں کی طرح ہی ملتے ہیں۔ دسنوی صاحب نے مہاراشٹر میں اردو کے اس روشن پہلو کو نظر انداز کیا ہے اور ممبئ کا ذکر دوسرے کسی طریقے سے کیا ہے، اس رُخ سے نہیں جہاں انھوں نے مدھیہ پردیش میں اردو کی تصویر پیش کی ہے، وہیں انھیں مہاراشٹر اور خاص کر ممبئ سے اردو کے رشتے کو نہیں بھولنا چاہیے تھا۔

میرا ارادہ ۱۵۲ صفحات کے اس اردو نامے کی اہمیت کو کم کرنے کا قطعی نہیں ہے۔ یہ کتاب اردو کے سنجیدہ قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہے اور یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ پہلی جیسی نہ سہی، لیکن 'میں ہوں' یعنی 'میں اردو ہوں'۔ اردو کا وجود ہی اس کتاب کا ماحصل ہے اور سب سے خاص بات ہے اس کی قیمت جو مصنف اور کتاب کے ناشر عبدالقوی دسنوی صاحب نے خود مقرر کی ہے یعنی:

''مادری زبان اردو سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترام آدمیت'' صحیح معنوں میں اس کی قیمت چکانا عہد کی ضرورت تو ہے مگر کافی مہنگی جو آج کم ہی لوگ چکا سکیں گے۔ لیکن جس کے دل میں خلوص ہے اس کے لیے بہت سستی بھی ہے اور وہ آسانی سے یہ قیمت چکا سکتا ہے۔

(مبصر: احمد وصی)

(۷)

کاروانِ ادب، بھوپال، جلد چہارم، شمارہ نمبر ۱۷

جناب عبدالقوی دسنوی نہ صرف بھوپال بلکہ برصغیر ہندو پاک کی ایک محترم، معتبر اور بزرگ اردو دوست کا نام ہے۔ آپ نے پوری زندگی گیسوئے اردو کی مشاطگی میں صرف کی ہے۔ سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج جو اپنے شعبۂ اردو اور اس کی شاندار ادبی خدمات

کی وجہ سے پوری اردو دنیا میں مشہور ہے۔ اس کو ناموری عطا کرنے میں دسنوی صاحب کی عرق ریزی ہے۔ آپ نے سیفیہ کالج میں طلبا کی تعلیم و تربیت اور تدریس کا کام ملازمانی ذمہ داری سمجھ کر کبھی نہیں کیا۔ تدریس تو آپ کو اپنے والد پروفیسر سعید رضا، سینٹ زیویرس کالج، بمبئی سے بطور وراثت ملی ہے۔ آزادی کے بعد بھارت میں اردو کے ساتھ ظلم کی حد تک جو ناانصافی ہوئی ہے اس کے ایسے گہرے زخم آپ کے دل پر لگے ہیں کہ آپ عمر بھر اردو کے سپہ سالار کی طرح اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے نبرد آزما ہیں۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں آپ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ آزاد، علامہ اقبال اور مولانا حسرت کے بعد بھوپال اور بھوپال سے وابستہ رہی اردو کی عظیم شخصیات کی خدمات اور کارناموں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظرِ عام پر لانے کے لیے آپ ہمیشہ فعال رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ اردو پر حکومتِ وقت کی جانب سے کیے گئے جبر و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''میں اردو ہوں'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں آپ کے کئی ایسے مضامین شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً آپ نے اردو پر مظالم کا سلسلہ روکنے کے لیے اراکینِ بست و کشاد کو متوجہ کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اس کام میں آپ ابتدا سے ہی مشغول ہیں سب سے پرانا مضمون ۱۹۵۲ء میں دورِ حیات میں شائع ہوا تھا لیکن زیادہ مضامین آپ کے سیفیہ کالج سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد سے لے کر ۲۰۰۳ء تک کی مدت کے ہیں۔ ان سب مضامین میں آنند ملا کے اس شعر کے محور پر گھومتے نظر آتے ہیں:

دی ہے مجھے دو آبۂ گنگ و جمن نے جو زباں
آج اسی کو حکم ہے گنگن و جمن سے دور دور

ابتدا میں اردو سے متعلق مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور فراق کی تقاریر اور اظہارِ خیالات کے اقتباسات ہیں۔ اسی کے بعد ''مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی نمائندہ زبان'' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون ہے، جس میں اردو کے بحیثیت ایک پیار کی میٹھی زبان کے ارتقا سے لے کر جنگِ آزادی میں اس کا حصہ اور آزادی کے

بعد اس پر مظالم کی داستان ہے۔ آخر میں مصنف نے اردو سے متعلق اپنی تحریروں کا اشاریہ بھی دیا ہے۔ بالکل آخر میں ''کچھ اردو کے بارے میں قدر دانِ اردو کے خیالات'' کے عنوان کے تحت سر تیج بہادر سپرو، مولوی عبدالحق، ابراہیم یوسف، مولانا حبیب ریحان ندوی، کیلاش نرائن سارنگ، ڈاکٹر ابو محمد سحر، شفیقہ فرحت وغیرہ کے خیالات درج کیے ہیں۔

یہ کتاب بھارت میں آزادی کے بعد اردو پر کیے گئے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج کی ایک دستاویزی داستان ہے اور ہر محبِ اردو کو پڑھنے کے ساتھ اردو کے لیے عملی قدم اٹھانے اور اسے اس کے پچھلا مقام پر دوبارہ فائز کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ کتاب کی قیمت ''مادری زبان سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترامِ آدمیت'' ہے اس لیے اس پر عمل کیجیے اور کتاب حاصل کیجیے۔

مبصر: کوثر صدیقی

(۸)

ماہنامہ ''انتساب'' سرونج، شمارہ ٦٠ (انور شیخ نمبر)

عالمی شہرت یافتہ محقق و نقاد عبدالقوی دسنوی صاحب ایک طویل عرصہ سے اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اردو زبان و ادب پھلے پھولے، نئی نسل اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسے استعمال کرے، روزمرہ کی زندگی میں اسے برتے۔ ان کے دل میں اردو کی ترویج و اشاعت کے تعلق سے تڑپ ہے۔ اردو سے ان کی محبت کا حال کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے، کیوں کہ بہت بڑی تعداد میں بڑے بڑے شاعر و ادیب اور نقاد و محقق ان کے شاگرد ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ سب دسنوی صاحب ہی کی کوشش و محنت کا نتیجہ ہیں کیوں کہ سیفیہ کالج میں اردو کے تعلق سے جو چہل پہل تھی وہ انھیں کی وجہ سے تھی۔ طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تحریری کام بھی کیا ہے۔ ان کی تصنیف کردہ کتابوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر مشاہیر ادب سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ ابھی چند مہینے قبل ہی میں نے ان کی کتاب ''بمبئی سے بھوپال تک'' پر

تبصرہ کیا تھا۔ ابھی چند ماہ ہی گزرنے پائے تھے کہ ان کی نئی کتاب ''میں اردو ہوں'' سیفی صاحب کے پاس آ پہنچی۔ انھوں نے یہ کتاب اٹھا کر میرے حوالے کر دی کہ میں اس پر تبصرہ کروں اور تبصرہ کر کے انھیں کتاب واپس کر دوں۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ ہمیشہ ہی تبصرہ کرنے کے بعد سیفی صاحب کی کتابوں کو واپس کر دیتا ہوں ان کا یہی کرم کیا کم ہے کہ ان سے تعلق کی وجہ سے بہت سی ایسی کتابیں اور رسائل پڑھنے کو مل جاتے ہیں جو ان سے تعلق کے بغیر نہیں مل سکتے۔

''میں اردو ہوں'' عبدالقوی دسنوی صاحب کی ایک ایسی کتاب ہے جو اردو زبان و ادب سے ان کے تعلق اور محبت کی ترجمان ہے۔ ان کی تحریروں میں درد ہے تڑپ ہے کڑھن ہے۔ اس کتاب میں دسنوی صاحب کے وہ مضامین ہیں جو مختلف اوقات میں اردو زبان کے تعلق سے انھوں نے تحریر کیے ہیں اور کسی نہ کسی رسالہ یا اخبار میں چھپے بھی ہیں۔ انھوں نے ان تحریروں کے ذریعہ یہ کوشش کی ہے کہ اہلِ اردو اپنی زبان کی اہمیت و ضرورت اور اس کی افادیت کو سمجھیں، اسے خود بھی استعمال کریں اور اپنے بچوں کو بھی سکھائیں اور پڑھائیں۔ اردو تہذیب و ثقافت سے انھیں روشناس کرائیں۔ اردو کی محبت ان کے دلوں میں پیدا کریں کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے تبھی تو کہا جاتا ہے کہ جس قوم کی تہذیب کو مٹانا ہو تو اس کی زبان کو مٹا دو تہذیب اپنے آپ ہی دم توڑ دے گی۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے، اردو زبان کو مٹانا گنگا جمنی تہذیب کو ختم کرنا ہے جو لوگ اردو زبان کو کسی بھی طرح سے نقصان پہنچا رہے ہیں وہ گنگا جمنی تہذیب کی جڑوں کو کاٹ رہے ہیں۔ عبدالقوی دسنوی صاحب کی کتاب ''میں اردو ہوں'' کی اشاعت کا سبب یہی جذبہ ہے کہ گنگا جمنی تہذیب مٹے نہیں بلکہ پروان چڑھے اور پھلے پھولے، ہر دور میں کچھ ایسے ناعاقبت اندیش لوگ بھی رہے ہیں جو کہ عرصہ تک اردو سے محبت کا دعویٰ کرنے کے بعد آخر وقت میں اردو کے لیے مارِ آستین ثابت ہوئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین صاحب کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں مسلمانوں اور اردو زبان کو تقسیم ہند کا ذمہ دار ہندوستان سے غداری کرنے والا کہا گیا ہے۔ اس کتاب میں جین صاحب نے اپنی طرف سے کچھ نہ کہنے

کے برابر کہا ہے صرف اسلام دشمن اور اردو دشمن مصنفین کی کتابوں سے اقتباسات پیش کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ محقق کی حیثیت سے شہرت رکھنے والے جین صاحب نے اس کتاب میں خود کے بتائے ہوئے تحقیق کے اصولوں سے کھلے عام انحراف کیا ہے۔

جب یہ کتاب سیفی صاحب کو ملی اور انھوں نے پڑھا تو مجھ سے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا۔ متین صاحب یہ کتاب پڑھنے کے بعد آج رات مجھے نیند نہیں آئی، اگر پروفیسر گیان چند جین صاحب جیسے مشہور زمانہ محقق کے علاوہ کسی عام آدمی نے لکھی ہوتی تو مجھے یہ احساس نہ ہوتا۔ کتاب پڑھنے کے بعد سیفی صاحب نے جین صاحب کی کتاب پر ''انتساب'' میں اظہارِ خیال کرنا شروع کیا، ابھی سیفی صاحب کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ مشہور وبے بدل نقاد محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے جین صاحب کی کتاب پر بے لاگ تحقیقی وتنقیدی تبصرہ کیا جس نے تمام ادبی دنیا میں دھوم مچادی، کئی رسائل میں فاروقی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا۔ فاروقی صاحب کا لکھنا تھا کہ تمام رسائل والوں نے جین صاحب کی کتاب پر لکھنا شروع کر دیا۔ اگر فاروقی صاحب اس کتاب پر نہ لکھتے تو اکثر رسائل والوں میں وہ لکھنے کی ہمت نہیں تھی جو فاروقی صاحب کے لکھنے کے بعد ہوئی، ہاں سیفی صاحب جیسے سود وزیاں سے بے نیاز لکھ بھی سکتے تھے جیسا کہ سیفی صاحب نے قسط وار ''انتساب'' میں لکھنا شروع بھی کر دیا تھا لیکن فاروقی صاحب جیسی عظیم شخصیت ایسے حالات میں خاموش رہے یہ کیسے ممکن ہے۔ فاروقی صاحب کے لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ ہر ایک نے انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا، ادھر سیفی صاحب نے تیسری قسط کی اشاعت کے ساتھ یہ کہہ کر سلسلہ کو آگے بڑھانے کی نفی کر دی کہ اب فاروقی صاحب کے لکھنے کے بعد مزید قسطیں شائع کرنے کی ضرورت نہیں، لہٰذا اس بحث کو یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

چوں کہ آئے دن اردو کے تعلق سے گمراہ کن باتیں کہی جاتی رہی ہیں ایسے حالات میں ایک محب اردو اپنی زبان وتہذیب کے خلاف جب ایسی باتیں سنتا ہے تو خاموش نہیں رہ پاتا جس کا اظہار وہ اپنی تقریروں وتحریروں میں کرتا ہے یہی حال عبدالقوی دسنوی صاحب کا ہے۔ اردو زبان وادب سے محبت اس کی تہذیب وثقافت سے محبت کے جذبہ

سے سرشار ہوکر مختلف اوقات میں دسنوی صاحب نے جو تحریریں قلمبند کی ہیں انھیں کے مجموعہ کا نام ہے ''میں اردو ہوں'' اردو محبت کی زبان ہے، میل ملاپ اور اخوت و بھائی چارہ کی زبان ہے، احترام انسانیت اور احترامِ وطن کی زبان ہے، مادرِ وطن سے محبت کرنا سکھاتی ہے، بھائی کو بھائی کے ساتھ مل کر رہنا سکھاتی ہے، ہر انسان کے ساتھ خیر خواہی کرنا سکھاتی ہے اور علامہ اقبال سے یہ کہلواتی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اردو زبان کے شاعروں وادیبوں نے اتنی بڑی تعداد میں وطن سے محبت کا اظہار اپنی شعری ونثری تحریروں وتقریروں کے ذریعہ کیا ہے اگر انھیں جمع کیا جائے تو ان کے مجموعوں سے ایک بڑی لائبریری وجود میں آسکتی ہے۔ اردو زبان سے محبت وعشق نے دسنوی صاحب سے مختلف اوقات میں جو مضامین لکھوائے ہیں وہ کتابی شکل میں ''میں اردو ہوں'' کے نام سے وجود میں آچکے ہیں۔ یہ کتاب اسی سال ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ ایک سو باون صفحات پر مشتمل اس خوبصورت کتاب کی قیمت ہے مادری زبان اردو سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترامِ آدمیت، یہ قیمت ہر اردو لکھنے پڑھنے والے کے لیے یا صرف متعلقین کے لیے یہ تو دسنوی صاحب ہی بتا سکتے ہیں بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صلائے عام ہے۔

مبصر: محمد متین ندوی

☆☆

خطوط

(۱)

۱۱/اپریل ۲۰۰۶ء

محترم قوی صاحب کو اللہ نے ایک جذبہ عطا کیا ہے، نوادرات کو یکجا کر کے ان کو محفوظ کرنا، یہ نوادرات کتابوں کی شکل میں ہوں یا واقعات یا کسی اہم شخص کی سوانح کی شکل میں۔ گھر گھر جا کر، نادر کتابیں حاصل کر کے انھیں شعبہ کی زینت بنایا کرتے تھے۔ اہم اشخاص سے مل کر ان کے بارے میں خود ان کی زبان سے معلومات حاصل کر کے اسے اچھی زبان میں قلم بند کرتے تھے یا اقارب سے مل کر ان کے عزیزوں کے بارے میں معلوم کر کے اسے تحریر میں محفوظ کرتے۔

موجودہ کتاب بھی ان کے اسی جذبہ کا نمونہ ہے۔ ماضی سے حال تک اردو کے متعلق اہم بیانات، واقعات۔ ان کا تعلق سیاست سے ہو یا لسانیات سے یا رسم الخط سے سب بڑی محنت سے حاصل کر کے ایک کتاب کی شکل دی ہے۔ ان کے انتخاب اور ترتیب میں قوی صاحب کی بالغ نظری نمایاں ہے۔

میں اردو داں تو نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے یہ کتاب اردو طلبا اور محققین کے لیے اور ادیبوں کے لیے بہت اہم ثابت ہوگی۔

(پروفیسر) ذکی الرحمٰن خاں (بھوپالی)

(۲)

بھوپال

۲۹/اپریل ۲۰۰۶ء

مکرمی جناب دسنوی صاحب السلام علیکم

''میں اردو ہوں'' آپ نے کتاب عنایت فرمائی۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔

دراصل کتاب پڑھنے میں تاخیر ہوگئی کیوں کہ دفتر اور گھر کی ذمہ داریاں تو تھکا مارتی ہیں۔ اس پر مزید پریشانی یہ ہوئی کہ میری نواسی کی طبیعت خراب ہوگئی تو دفتر اور گھر کے

علاوہ اسپتال بھی شامل ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ٹھیک ہے۔

آپ کی کتاب مختصر اور جامع ہے۔ کل صفحات ۱۵۱ ہیں اس کی یہ خوبی ہے، کیوں کہ زیادہ طوالت والی کتاب کو پڑھنا بھی ہم جیسے لوگوں کے لیے دشوار ہے باوجود شوق کے وقت کی کمی بڑا مرحلہ بن جاتا ہے۔ پورے ۳۳ عنوانات کی الگ الگ اہمیت ہے اور معلومات سے بھرپور بھی ہیں۔ کتاب پڑھ کر دل سے آپ کے لیے دعائیں نکل گئیں۔ دراصل زبانی جمع خرچ اور بات ہے اور دل سوزی الگ۔ آپ جیسے ہی لوگ سچے محب وطن اور محب اردو ہیں، آپ نے جا بجا اردو کی اہمیت اردو کے سچے پرستار ہونے کے ناطے جو مشوروں سے نوازا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ مثلاً محب اردو اداروں اور اردو اکیڈمیوں کی توجہ دلائی ہے کہ ان کو کس طرح کام کرنا چاہیے وہ قابلِ تعریف ہے اور آپ نے سردار جعفری کے ان الفاظ کی یاد دلائی ہے کہ "ہمارا وطن ہندوستان اپنی پیدا کی ہوئی، خوبصورت، شیریں طاقتور اور وطن پرست زبان سے محروم ہو جاتا ہے"۔ لیکن دانشور اپنی لاعلمی اور غلط فہمی کی وجہ سے بے حسی کا شکار ہیں اور آپ کی یہ رائے کہ حکومت کا بھروسہ چھوڑنا ہوگا، یقیناً بے لاگ ہے اور میرے خیال میں بھی بغیر اردو رسم الخط کے یہ زبان ایسی ہوگی جیسے ایک خوبصورت جسم بغیر روح کے۔ بہر حال ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو اردو کے نام سے شہرت کی بلندیوں پر اپنے جھنڈے گاڑ رہے ہیں اور دیوناگری کے راگ الاپ رہے ہیں اور حکومت کی چاپلوسی کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا کل اور ان کا کل کا یہ بچہ جو (انگریزی میڈیم میں پڑھتا ہے جس کو گھر میں اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے) گردشِ دوراں کے معنی نہیں سمجھ پائے گا۔ اس لیے اس زبان کو اور آسان کرو، یعنی وہ لوگ اردو دشمنی پر کمربستہ ہیں اور خود کو محب اردو اور محبِ وطن کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اور اپنی قابلیت کا سکہ دوسروں پر جمانے کے لیے کوشاں و سرگرداں رہتے ہیں۔

بس اللہ ان کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

فقط

شاہ جہاں غنی

(سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال)

(۳)

بھوپال

۳؍مئی ۲۰۰۶ء

محترم جناب عبدالقوی صاحب زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی مرتبہ تازہ کتاب ''میں اردو ہوں'' موصول ہوئی، شکریہ وہ اپنے فضائل، مناقب، صلاحیت وافادیت اور ضرورت واہمیت کا بزبانِ خود نہ صرف برملا تعارف کرا رہی ہے بلکہ گزشتہ چھ عشروں میں اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں گزری ہوئی بپتا کی داد فریاد بھی کر رہی ہے لیکن کن سے؟ ان سے جن کے دل ہیں مگر بے حس، آنکھیں ہیں مگر کوری، کان ہیں مگر بہرے، زبانیں ہیں مگر گنگ!

پھر بھی زبان وادب کے چند دیوانے خدمت گار (جن میں مولف کتاب سر فہرست ہیں) کون سنتا ہے فغانِ درویش؟ کی حقیقی صورتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے موقع بہ موقع صدائیں لگاتے رہتے ہیں، خواہ کوئی سنے نہ سنے!

ایسا لگتا ہے کہ کم از کم ہندوستان میں اردو زبان کا معاملہ بھی دنیا بھر میں دین اسلام جیسا ہو گیا ہے کہ ہر ایک اس کی حقانیت کا نہ صرف قائل بلکہ بسا اوقات داعی بھی ہے مگر عمل اور عملی خدمت کے لیے دیگر لوگوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ اہلِ اردو کے گھروں سے اردو کی دربدری پر کیسے بند لگایا جائے؟ یہ بھی بالکل ایسے ہی ہے جیسے اہلِ ایمان کے دلوں میں ایمان کے تقاضوں کو کیسے عملاً جگایا جائے؟

بہر حال آپ کی اردو کے ساتھ والہانہ دلبستگی اور استقلال کے ساتھ اس کی خدمت لازوال ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گی آپ کو بھی یاد رکھے گی۔ والسلام

(پروفیسر) مسعود الرحمٰن ندوی

(۴)

نئی دہلی

۱۱ر مئی ۲۰۰۶ء

محترمی معظمی تسلیم!

امید ہے آپ مع متعلقین کے بخیر ہوں گے۔

نعمان صاحب نے آپ کی تازہ تصنیف "میں اردو ہوں" دی جو میرے لیے قیمتی تحفہ ہے۔ پڑھ تو دو دن میں ہی لی تھی، مگر اس کا شکریہ اب ادا کر رہی ہوں۔

اردو زبان اور ہندوستان میں اس کی صورتِ حال کا بہت خوب جائزہ ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز آپ نے تیار کر دی ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ آپ نے بہت خلوص، دردمندی سے اردو کی صورتِ حال کو اجاگر کیا ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے کہ جس کو اپنی زبان سے عشق ہو اور اس کی بقا و فروغ کے لیے مضطرب ہو۔ اردو اس کے صرف روزی روٹی کا وسیلہ نہ ہو۔

بہر حال خدا آپ جیسے مخلص اور علمی کاموں سے شغف رکھنے والوں کو تندرست اور زندہ سلامت رکھے۔ ہمیں بھی کچھ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

گھر میں سب کو سلام و دعا کیجیے۔

نوٹ: کتاب کی قیمت انمول بھی ہے اور نایاب بھی۔

خاکسار

(پروفیسر) صغرا مہدی

(۵)

بھوپال

۱۲ر مئی ۲۰۰۶ء

استاد مکرم

اللہ آپ کی عمر دراز کرے

اور ہمارے سروں پر آپ کا سایہ تا دیر قائم رکھے

آپ کی محبت اور نوازش ہے
کہ آپ اپنی کتب
اس حقیر کو ازراہِ کرم بھیجتے ہیں
اور اس پر رائے بھی طلب فرماتے ہیں۔
"میں اردو ہوں"
اچھی کتاب ہے
کتابت اچھی، طباعت نفیس
اور موضوع تو کہنا ہی کیا
اس پر آپ کا بیان، طرزِ استدلال
اور اس بیان کے پس پردہ شدید جذبہ،
جو لہو بن کر آپ کی تحریروں میں رواں ہے
اور روشنی بن کر راہ دکھا رہا ہے۔
خدا کرے آپ کے خواب پورے ہوں
ہمارے وطن کی مٹی نم بھی ہے اور نمو پذیر بھی
آپ نے زبان اور ملک کے لیے جو جوت جگائی ہے
یہ حالی کے چراغ کی طرح ہے
شب یلدا میں روشن
اور بھٹکنے والوں کے لیے رہنما
ویسے میں کس قابل ہوں؟
کہ اظہارِ خیال کروں
"من آنم کہ من دانم"
بس یہی کہہ سکتا ہوں
"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

دعاؤں میں یاد رکھیں
اقبال مسعود

(۶)

نئی دہلی

۲؍جون ۲۰۰۶ء

محترمی — سلام مسنون!

آج ڈاکٹر محمد نعمان نے آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' آپ کی جانب سے عطا کی۔ یادآوری کا شکریہ۔ یہ پوسٹ کارڈ محض کتاب ملنے کی رسید ہے۔ پڑھنے کے بعد ہی کچھ تحریر کروں گا۔

کتاب از سرورق اول تا آخر ''اردو ہی اردو'' ہے۔ خدا کرے اس پیغام کو بھی سمجھیں اور عمل کریں۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام

خیر اندیش

فیروز

(محمد فیروز دہلوی)

(۷)

علی گڑھ

۶؍جون ۲۰۰۶ء

مکرمی ومحترمی — السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا قیمتی تحفہ ''میں اردو ہوں'' نظر نواز ہوا۔ آپ کی مہربانی ہے کہ اپنی تصنیفات سے نوازتے رہتے ہیں اردو سے آپ کی محبت مثالی ہے، کاش سب اردو والے اسی جذبے سے سرشار ہوتے۔ ساتھ ہی بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے وطن سے بھی اتنا ہی گہرا تعلق خاطر ہے اور اسی لیے آپ ہر مسئلے کو وطن کی خیر خواہی اور نیک نامی کے تناظر میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔

آپ کے مضامین کا پیش نظر مجموعہ مختلف متنوع موضوعات پر حاوی ہے۔ اس میں

اردو دوستوں کا بھی ذکر ہے اور اردو کے بعض اہم مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔
''آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کی رفتار'' اور ''مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق'' جیسے مضامین معلومات افزا ہیں۔

بس اتنا ضرور ہے کہ تمام مشکلات اور ناانصافیوں کے باوجود مجھے ہندوستان میں اردو کا مستقبل اس سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے جتنا آپ محسوس فرماتے ہیں۔

مختار الدین احمد صاحب اور حکیم ظل الرحمٰن صاحب کو کتاب بھیج دی۔

امید ہے آپ بفضلہٖ بخیریت ہوں گے۔

نیاز مند
ریاض الرحمٰن شیروانی

(۸)

علی گڑھ
۸ر جون ۲۰۰۶ء

برادر گرامی پروفیسر عبدالقوی صاحب
سلام مسنون!

پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی کے ذریعہ آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' موصول ہوئی۔ اردو سے متعلق بہت سے مسائل کا آپ نے اس مجموعہ میں احاطہ کیا ہے۔ اردو کے بارے میں جو سوالات عام طور پر ذہن میں آتے ہیں یا وقتاً فوقتاً مختلف حلقوں کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں ان کے جواب بھی اس میں آگئے ہیں۔ سیاسی قائدین گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد کی زبان سے بھی آپ نے اردو کی بات سنوائی ہے۔ اردو کی بے بسی اور اس پر جو وقت آیا ہے اس کے محاکمہ کے ساتھ آزادی کے بعد اردو تحقیق کی صورتِ حال اور خاص طور پر مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق پر آپ کا اظہار خیال بجا طور پر حقیقت پر مبنی ہے۔

ملا فخر الدین کی اردو خدمات ہر طرح خراجِ تحسین کی مستحق ہیں۔ میں ان کی قومی و تعلیمی خدمات سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ان کے بعد نہ صرف شعبۂ اردو بلکہ سیفیہ کالج کا جو حشر ہوا وہ بہت تکلیف دہ ہے۔

آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ اس طرح کے اپنے سارے مضامین کو کتابی شکل دے دی۔ اب انھیں کافی حد تک مربوط شکل میں یکجا طور پر پڑھا جا سکے گا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص
(پروفیسر حکیم) ظل الرحمٰن

(۹)

کولکاتا
۱۲ر جون ۲۰۰۶ء

برادرِ محترم عبدالقوی دسنوی صاحب   سلام وخلوص!

مرسلہ تحفہ ملا۔ ممنونِ کرم ہوں۔ ''میں اردو ہوں'' آپ کی وطن دوستی اور اردو کے تئیں والہانہ محبت کی آئینہ دار ہے۔ اردو سے متعلق آپ کی تحریریں برابر پڑھتا رہا ہوں، اب یکجا طور پر ان مضامین سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ یہ مضامین اردو خدوخال کا مرقع ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اردو کے حال و مستقبل کی جھلکیاں بھی اس میں ملتی ہیں۔ آپ کی آرزوؤں کے نقوش نے ان میں مزید تہہ داری پیدا کر دی ہے، اس کی اشاعت پر ہدیہ تبریک قبول ہو!

ان دنوں آپ کی صحت کیسی ہے؟ گزشتہ کچھ دنوں سے میں مختلف عوارض کا شکار ہوں۔ ڈاکٹروں نے زیادہ ذہنی و دماغی کاموں سے روک رکھا ہے۔ دعا کی درخواست ہے۔

عزیزم عاصم سلمہ الہ آباد گئے ہوئے ہیں، دو چار دنوں میں واپس آجائیں گے۔

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر ہوں۔

نیاز آگیں
علقمہ شبلی

(۱۰)

دہلی۔ ۱۳؍جون ۲۰۰۷ء

محترم ومکرم سلام مسنون!

گرامی نامے ملے، تازہ تصنیف کے دو نسخے بھی ملے۔ خوشی ہوئی اور تحریک بھی ملی کہ اب بھی قلم جوان ہے اور فکر تازہ کار۔ صحت کی سلامتی کے ساتھ ان دو چیزوں کی موجودگی نعمتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ آپ کی نظر میں اردو پر دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے افتاد پڑے اور اردو والوں کی بے حسی اور بدتوفیقی نے اتنے برے دن دکھائے کہ الاماں!

مگر بے چاری زبان اپنی تاب وتوانائی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ یہ صرف فیضانِ سماوی کا ہی نتیجہ ہے۔ ورنہ ہم نے اسے دریا برد کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ آپ جیسے مخلص نے ایک دیا روشن رکھا جو اب بھی قندیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کئی عنوانات بہت پسند آئے۔ اختصار میں آپ نے درونِ دل کی کیفیات کو بیان کر کے تاثرات کی دنیا بخش دی۔ ہاں چند نام ایسے بھی ہیں جو اردو کے قاتل رہے ہیں۔ درپردہ وہ بہ ظاہر اردو سے ہر فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور جیب ودامن کو گراں بار کیا ہے۔ یہ آپ کا خلوص ہے کہ آپ انھیں بھی محبانِ اردو میں شمار کرتے ہیں۔

بہر حال ناچیز تو آپ کی پر خلوص شخصیت کا قدر دان ہے اور آپ بے حد مروت پسند ہیں۔ شاید اسی سبب میرے مخدوم بھی ہیں۔ دوسرا نسخہ محمد حسن صاحب کو پیش کروں گا۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

ناچیز عبدالحق

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

(۱۱)

علی گڑھ۔ ۱۳؍جون ۲۰۰۶ء

محبی عبدالقوی صاحب السلام علیکم!

آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' موصول ہوئی۔ ممنون ہوا۔ آپ بڑے فعال ہیں۔ اس عمر میں بھی ہمیشہ علمی وادبی کاوشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ صرف لکھتے ہی نہیں

رہتے کتابوں کی اشاعت کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں۔ یہ دوسرا کام پہلے کام سے بھی مجھے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔

موضوع بھی بہت اہم آپ نے اختیار کیا ہے۔ بڑی مفید چیزیں آپ نے ایک جگہ بہت اچھی ترتیب سے پیش کی ہیں۔ ایسے کاموں کو آپ بڑے سلیقے سے انجام دیتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ کے کرم فرماؤں کی فہرست ملی، اس میں دونوں ملکوں کے مشاہیر شامل ہیں۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی بڑی قیمتی تحریریں آپ نے شائع کی ہیں۔ بار بار شائع ہونی چاہیے۔ میں خلیق انجم صاحب کو لکھوں گا کہ وہ انھیں مناسب طور پر 'ہماری زبان' میں شائع کریں۔ اردو تحقیق والا مضمون میں نے خاص طور سے دلچسپی سے پڑھا۔ 'معیار' پٹنہ قاضی عبدالودود کی وفات کے نہیں بند ہوا، یہ اسی سال بند ہوگیا جس سال شائع ہونا شروع ہوا یعنی ۱۹۳۶ء۔ دوماہی رسالہ تھا۔ اس کے چار پانچ شمارے ہی نکال سکے۔ ادارہ کسی نہ کسی حال میں اب بھی بند نہیں ہوا، لیکن فعال بھی نہیں رہا۔ کربل کتھا اس ادارے کی پہلی کتاب تھی جو شائع ہوئی۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

والسلام

مختارالدین

(۱۲)

رانچی

۱۴ر جون ۲۰۰۶ء

برادرِ محترم سلام ورحمت!

اچانک دس جون کی ڈاک سے آپ کا ایک گرانقدر تحفہ ''میں اردو ہوں'' موصول ہوا۔ ایک ہی نشست میں اس کا مطالعہ کیا اور دل خوش ہوگیا۔ آپ اس عمر میں بھی اس قدر جانفشانی سے کام کرتے ہیں، حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اردو کے لیے وقف کردی۔ مگر افسوس اہلِ علم پر اس کا بہت کم اثر ہے۔ انعام وغیرہ تو دور کی بات ہے کتاب کی اشاعت کے لیے بھی کوئی مالی تعاون نہیں۔

کتاب مجھے بے حد پسند آئی۔ ضرورت ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات اسکول کے نصاب میں بھی شامل کیا جائے۔

بھابھی محترمہ کی خدمت میں مودبانہ سلام عرض کریں گے۔ اہلِ خانہ کی جانب سے حسب مراتب تمام لوگوں کو سلام ودعا عرض کریں۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا بھائی

انوار انصاری۔

(۱۳)

رانچی

۱۴ر جون ۲۰۰۶ء

محترم جناب دسنوی صاحب سلام قبول کیجیے۔

گرمی کی چھٹیاں گزارنے کل ہی رانچی آیا اور پہلی فرصت میں ابی جان نے آپ کا نادر تحفہ عنایت کیا۔ اس کرم فرمائی کے لیے بے حد ممنون ہوں۔

کتاب کے سرسری جائزہ سے اندازہ ہوا کہ آپ نے موجودہ عہد میں اردو زبان کے مسائل سے متعلق ناگزیر پہلوؤں پر بہت سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور محبان اردو کو غور و فکر کرنے کی تحریک دی ہے۔ انشاء اللہ آپ کی یہ کاوش رائیگاں نہیں جائے گی اور اردو سے متعلق ادیب اور دانشور حضرات اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں ضرور دلچسپی لیں گے۔ میں جلد ہی اس اہم کتاب پر ایک بھرپور تبصرہ لکھ کر اشاعت کے لیے روانہ کروں گا۔ فی الوقت یہ چند سطریں رسید کے طور پر ارسال کر رہا ہوں۔

انشاء اللہ جولائی کے تیسرے ہفتے میں علی گڑھ واپس جاؤں گا۔

دعاؤں کا طالب

راشد انور راشد

وارانسی

۱۹؍جون ۲۰۰۶ء

بخدمت

پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب السلام علیکم

آپ نے اپنی گراں قدر تصنیف ''میں اردو ہوں'' عنایت کی۔ آپ کی نوازش ہے۔ یہ زبان جس طرح تعصب اور تنگ نظری کی شکار ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کتاب آج کی اہم ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے جواہر ریزوں کو ایک جگہ جمع کر کے اردو والوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا ہے۔ یہ کتاب وہ مشعلِ راہ ہے جس کی روشنی بہت سی غلط فہمیوں اور تعصب کے اندھیرے دور کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ اردو کی اس خدمت کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

آپ میرے تاثرات جاننا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کی معنویت پر روشنی ڈالنا میرے لیے سورج کو چراغ دیکھانے کے مترادف ہے۔

اس کتاب میں آزادی کے بعد اردو تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے اہم تحقیقی مقالوں کی فہرست میں میرے مقالے کو بھی شامل کیا۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ آپ نے میرے مقالہ ''تہذیب الاخلاق: تحقیقی تنقیدی مطالعہ'' پر اپنے مکتوب میں رائے زنی کرتے ہوئے میری محنت کو جس طرح سراہا ہے وہ آپ کی نوازش ہے۔ آج بھی وہ مکتوب دستاویز اور تبرک کی حیثیت سے میرے پاس محفوظ ہے۔

''سرسید کے فکری زاویے'' پیشِ خدمت ہے۔ یہ کتاب بھی آپ کی توجہ چاہتی ہے۔ خدا اردو والوں پر آپ جیسے محبِ اردو اور بزرگ کا سایہ برقرار رکھے۔

طالب دعا

نفیس بانو

(۱۵)

بمبئی۔ ۲۰/جون ۲۰۰۶ء

محترم عبدالقوی دسنوی صاحب　　　　سلام مسنون!

آپ کی ارسال کردہ کتابیں مل گئی ہیں۔ میں نے اس پر تبصرہ بھی لکھ لیا ہے۔ انشاء اللہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء کے "ہندوستانی زبان" میں شامل ہوگا۔ جولائی، ستمبر کا شمارہ پریس میں ہے، اس لیے اس میں شامل نہ ہوسکا۔

آپ کی اردو سے متعلق خدمات اور آپ کا اردو سے لگاؤ قابلِ رشک ہیں، یہی جذبہ بھی اردو والوں میں ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا کرے اور آپ کی تخلیقات سے ادب کے طلبا فیضیاب ہوتے رہیں یہی نیک خواہشات ہیں۔ فقط

نیک خواہشات کے ساتھ

محمد حسین پرکار

(۱۶)

بارسی ٹاکلی

۲۰/جون ۲۰۰۶ء

مکرم بندہ!　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی مشفقانہ سوغات "میں اردو ہوں" کی دو جلدیں موصول ہوئیں۔ "کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا"۔

اس انتہائی اہم کتاب کو محض تاثرات پر نہیں ٹالا جاسکتا ذرا پہلے سے لائن میں لگے چند اہم کاموں سے فراغت پالوں تو انشاء اللہ سطر سطر مطالعہ کر کے اس پر ایک اچھا سا مضمون لکھنے کی بساط بھر کوشش کروں گا۔ کہیں چھپوا بھی دوں گا اور ایک آدھ نقل پیش خدمت بھی کروں گا۔ بس ذرا سی زحمت انتظار فرمائیں تب تک دعاؤں میں یاد رکھیں۔

کمترین

محبوب راہی

(۱۷)

بھوپال

۲۱ر جون ۲۰۰۶ء

محترمی جناب قومی صاحب آداب!

آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' کو پڑھنا شروع کیا تو دلچسپی اگرچہ بڑھ گئی مگر میں زیادہ دیر تک لکھ پڑھ نہیں سکتا کیوں کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس لیے کئی قسطوں میں اسے پوری پڑھ سکا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ تک مسلسل پڑھ سکتا ہوں۔ میں پانچ سال سے اس عارضہ میں مبتلا ہوں۔ علاج کرتا ہوں ٹھیک ہو جاتا ہوں مگر پھر وہی پریشانی شروع ہو جاتی ہے۔

بہر حال آپ کی کتاب بہت ہی معلوماتی ہے۔ اردو سے متعلق مشاہیر اور سیاست دانوں کے اقوال کو شامل کر کے آپ نے اپنی کتاب کو بہت زیادہ وقیع بنالیا ہے۔ بھوپال اور مدھیہ پردیش کے بارے میں بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جو ایک ریسرچ اسکالر کے لیے کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں آپ نے کہا ہے کہ یہ کتاب اردو کے سلسلے میں آپ کے ان تاثراتی مضامین اور مہمان اداریوں پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً ملک کے اخباروں، جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوئے اور خاص طور پر ''ہماری زبان'' میں۔ آپ کی تحریریں اردو داں طبقے کو آسانی سے اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو والے اردو کے حق کے لیے برابر لڑتے رہیں اور اپنے اپنے گھروں میں اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں۔ اور والدین کو چاہیے کہ اسکولی تعلیم سے وقت نکال کر اپنے بچوں کو گھر میں اردو پڑھائیں۔ میں اس قسم کی کوششوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں جب چھاؤنی ولاتیان سے ساؤتھ ٹی ٹی نگر کے سرکاری کوارٹر میں منتقل ہوا تو اس وقت میرے بچے چھوٹے تھے جب انھیں اسکول میں داخل کیا تو وہاں آٹھویں جماعت تک سنسکرت لازمی تھی اور اردو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چنانچہ بچوں نے آٹھویں جماعت تک سنسکرت پڑھی لیکن میں نے اور خاص طور سے میری شریکِ حیات نے گھر میں خالی وقت میں بچوں کو اردو پڑھنا، لکھنا سکھایا اور آگے چل کر میں نے نویں

کلاس میں کوشش کر کے اردو کو جاری کرایا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے تمام بچے اچھی طرح اردو پڑھتے لکھتے ہیں، اگر چہ ان میں کچھ سائنس کے طالب علم بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض نے اردو میں اعلیٰ اسناد بھی حاصل کی ہیں۔

بھوپال کی ہی ایک مثال اور ہے وہ یہ کہ ۱۹۴۹ء میں ریاست بھوپال انڈین یونین میں شامل ہوگئی تو کچھ ماہ بعد ہی ریاست بھوپال (سی اسٹیٹ) کی سرکاری زبان ہندی ہوگئی۔ اس سے پہلے تمام ملازمین اردو میں کام کرتے تھے لیکن سرکاری زبان ہندی ہوتے ہی بھوپال کے تمام ہندو صاحبان ہندی میں آسانی کے ساتھ کام کرنے لگے، میں نے اپنے ہندو احباب سے سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے گھروں میں ہندی پڑھتے لکھتے تھے اور روٹی روزی کے لیے انھوں نے اردو خوب اچھی طرح سیکھی اور ملازمت حاصل کی۔ اردو سماج کو اس قسم کی مثالوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اپنے بچوں کو مادری زبان پڑھانا لکھانا اردو سماج کے ہر فرد کا فرض ہے، اس طرح اردو ترقی کر سکتی ہے اور باقی رہ سکتی ہے۔

آپ کے بارے میں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ کی تحریریں سادہ، دلنشیں اور پر اثر ہوتی ہیں۔ خدا کرے آپ اسی طرح لکھتے رہیں اور اردو کے کاز کو آگے بڑھاتے رہیں۔

آپ کا اپنا

(ڈاکٹر) قاسم نیازی

(۱۸)

پٹنہ

۲۳؍ جون ۲۰۰۶ء

مکرمی بصد ادب سلام و احترام

مزاج گرامی "میں اردو ہوں" عنایت فرمانے کا شکریہ۔ میں اس انتظار میں تھا کہ پوری کتاب پڑھ لوں تب رسید بھیجوں۔ آپ نے اردو سے متعلق تخلیقات کو یکجا کر کے ایک اہم کام کیا ہے۔ خاص طور سے یہ آئندہ نسل کے لیے مفید اور کارآمد ہوگا۔

اردو سے متعلق آپ کی محبت اور آپ کی خدمت کا تو دشمن کو بھی اعتراف ہوگا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ اپنے مشن میں ہنوز مشغول ہیں اور زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ یوں تو اردو کو آپ پر فخر ہے مگر بالخصوص اہلِ بہار کو ناز ہونا چاہیے کہ وطن سے دور اور غیر مناسب ماحول میں بھی آپ نے اردو کا چراغ روشن رکھا ہے۔

زمانہ گزرا کہ شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ شاید وطن کی طرف سفر نہیں ہوا، آپ کا کبھی آنا ہو تو مطلع فرمائیں تا کہ ہم بھی فیضیاب ہو سکیں۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

والسلام نیاز کیش
شفیع مشہدی

(۱۹)

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۲؍جولائی ۲۰۰۶ء

محترمی عبدالقوی دسنوی صاحب السلام علیکم!

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

''میں اردو ہوں'' بھجوانے کا شکریہ۔ دو ہفتے پہلے خالد محمود صاحب نے آپ کا یہ تحفہ مجھے دیا، فوری طور پر رسید نہ بھیج سکا۔ معذرت چاہتا ہوں۔

آپ کی کتاب میرے مطالعہ میں ہے، جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں اور بہت اچھا تاثر قائم ہو رہا ہے۔ آپ کی یہ کتاب ان تمام جہتوں سے اہم ہے جن کا اظہار سرورق پر ہوا ہے۔ یہ کتاب زبان، زمین، ثقافت اور معاشرے سے آپ کی محبت کی غماز ہے۔ خدا کرے آپ کے یہ سروکار قائم و دائم رہیں۔

آپ کا
انیس الرحمٰن
شعبہ انگریزی

بھوپال

۲؍جولائی ۲۰۰۶ء

محبّ مکرم گرامی قدر قوی صاحب   سلام و رحمت

مزاج مبارک!

خالد بھائی کے ذریعہ چند دن پہلے آپ کی عنایت کردہ کتاب ''میں اردو ہوں'' حاصل ہوئی۔

اس عنایت، نوازش کے لیے ممنون و مشکور ہوں۔

کتاب کے بارے میں مجھے یعقوب یاور سے معلوم ہوا تھا اور خواہش ہوئی تھی کاش! میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوتا جن کو اس کتاب کے دیدار اور مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ زہے نصیب! کہ یہ شرف آپ نے عطا کر دیا۔ اس کرم فرمائی اور حسرت نوازی کے لیے میں اپنی قسمت پر جتنا ناز کروں کم ہے۔

''میں اردو ہوں'' یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی اردو کو اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنا اور اپنے وجود کا یقین دلانا پڑ رہا ہے جب کہ آپ نے کتنے مقتدر حضرات پرستاران و محبانِ اردو (خواہ وہ کسی بھی شعبہ اور فکر کے ہوں) آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد کی آراء بڑی محنت اور مشقت سے یکجا کی ہیں۔ لیکن ان میں کتنے حضرات بطور خاص سیاست داں اردو کے تئیں مخلص اور نیک نیت تھے۔ ان سینکڑوں میں چند ہی نیک نیت اور مخلص رہے ہوں گے، جن کی بدولت ہی اردو زندہ ہے یا پھر یوں کہیے سسک سسک کر جی رہی ہے۔ آج بھی کتنے اردو کا دم بھرنے والے ہیں جو اپنی روٹیاں اس کی تندی سے سینک رہے ہیں۔ ان کی بلا سے اردو جیے یا مرے۔ بس وہ زندہ رہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ جب اردو نہیں رہے گی تو ان کا کیا ہوگا۔ ان کی مرغن غذا، روٹیوں کا کیا بنے گا — ! سچ تو یہ ہے کہ وہ اردو کے اس سسکتے اور دم توڑتے وجود میں بڑے بڑے مگر کھوکھلے بیان دے کر اپنا وجود مستحکم کر رہے ہیں۔ جس حمام میں سب ننگے ہوں وہاں ننگے پن کا شکوہ کس سے کیا جائے۔ آپ نے اشک امرتسری کا یہ شعر بہت

مناسب کوٹ کیا ہے:

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

اب ان حالات میں آپ چاہے یہ کہیں:

آدمیت احترام آدمی
را خبر شو از مقام آدمی

یا یہ کہیں:

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ہمیں ہی کرنا ہے جو کچھ کرنا ہے۔ یہ اب ہماری ملکیت ہے کیوں کہ تمام علمی، دینی، تہذیبی، معاشرتی، تمدنی علوم وفنون کا ذخیرہ اسی زبان میں موجود ہے، اس لیے:

اپنے کعبہ کی حفاظت ہمیں خود کرنی ہے
اب ابابیلوں کا لشکر نہیں آنے والا

آپ نے ''میں اردو ہوں'' شائع کر کے اور اس کا ہدیہ یا قیمت مادری زبان سے محبت رکھ کر سچے 'محبِ اردو' اور اردو کے تئیں نیک نیت اور پر خلوص ہونے کا جو ثبوت دیا ہے وہ کسی اور کی (جھوٹے دعویٰ داروں) کی قسمت میں کہاں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کتاب کی قیمت دو سو روپے رکھ کر بھی سوچتے... کم قیمت رکھی ہے۔ زیادہ ہوتا تو اور فائدہ ہوتا کیوں کہ محبانِ اردو اسے ضرور خریدتے۔ اس طرح زندگی کی گاڑی اور بہتر طریقہ سے چلتی۔

آپ نے اردو کو گنگا جمنی تہذیب کی امین، محبت و اتحاد و اتفاق اور وطن دوستی، مساوات اور احترامِ آدمیت کی زبان کہا ہے۔ اس میں دو رائے کی گنجائش نہیں۔ کاش! یہ اہم نکتہ دوسرے بھی سمجھ سکتے!!

اگر اب بھی سمجھ گئے تو آپ کی محنت و کاوش اور اردو کے لیے آپ کا خلوص و محبت کا جذبہ یقیناً کامیابی سے ہم کنار ہوگا، ورنہ اللہ اللہ خیر سلّا

آپ کی اس نیک نیتی اور مادری زبان کے خیر کے لیے تگ ودو، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین!! اللہ حافظ

خیر اندیش۔صابر ادیب

(۲۱)

رامپور

۵/جولائی ۲۰۰۶ء

استادِ محترم السلام علیکم!

آپ کے خطوط مورخہ ۵/مئی اور مورخہ ۱۳/جون ۲۰۰۶ء مل گئے تھے۔ ساتھ ہی آپ کے ذریعہ بھیجی گئی دو کتب (الف) بھوپال میں اردو انضمام کے بعد از ڈاکٹر محمد نعمان خاں (ب) میں اردو ہوں از عبدالقوی دسنوی رجسٹری سے بحفاظت مل گئیں۔ ان عنایات علمیہ کے لیے ممنون و مشکور ہوں۔

آپ نے ۵/مئی کے خط میں ہمارے رسالہ ''ضیاء وجیہ'' کے سلسلے میں جو تاثرات قلمبند فرمائے ہیں وہ ہمارے لیے سرمہ نورِ نظر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کلماتِ مشفقانہ کی بدولت تو آج اردو زندہ ہے اور اردو والے اپنے حوصلے قائم رکھے ہوئے ہیں وگرنہ اردو رسائل کی اشاعت دورِ حاضر میں ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ بحمد اللہ ہم لوگ اپنی مادرِ علمی مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ کے سرپرستوں کے طفیل ''ضیاء وجیہ'' کو پچھلے سترہ سالوں سے زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ بہت سے نئے قلم کار اس رسالہ کے ذریعہ نشر و اشاعت کے میدان میں آچکے ہیں۔ اپنے خط کے آخر میں میری صحت کے لیے جو دعا آپ نے فرمائی ہے اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ میری کوشش ہوگی کہ رسالہ ''ضیاء وجیہ'' مستقل میں آپ کو بھیجتا رہوں۔

''بھوپال میں اردو'' مولفہ ڈاکٹر نعمان خاں صاحب کے سلسلہ میں آپ نے میری درخواست قبول فرمائی اور کتاب بھجوائی اس کے لیے آپ اور برادرم نعمان خاں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، علاوہ ازیں آپ نے یہ مزید کرم فرمایا اپنی مفید مطلب اور اصلاحی کتاب ''میں اردو ہوں'' بھجوائی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر نعمان خاں کی کتاب ''بھوپال میں اردو'' کے مطالعہ سے جہاں بہت سی معلومات میں اضافہ ہوا وہیں یہ تحریک بھی ملی کہ ''رامپور میں اردو انضمام سے پہلے'' اور ''انضمام کے بعد'' یہ دونوں پہلو ابھی تک تشنہ ہیں۔ ان پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ میں اس ضخیم اور مفید علمی خدمت کے لیے ڈاکٹر نعمان خاں صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جلد ہی انھیں بھی خط لکھوں گا۔

بھوپال میں اگر کچھ شعبوں کی لائبریریاں ہوں جو رسائل خریدتی ہوں تو انھیں موقع بموقعہ متوجہ کرائیے کہ اہلِ بھوپال ہمارے رسالہ سے مستفید ہوتے رہیں، اس طرح ہماری اشاعت میں بھی اضافہ ہوگا۔

میں نے خط کی ابتدا میں آپ کو استادِ محترم کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے شاید آپ کو یاد ہوگا ۱۹۸۸ء میں میں سیفیہ کالج کی لائبریری سے انیسویں صدی کے گلدستوں کے استفادہ کے سلسلے میں آپ نے میری جابجا رہنمائی فرمائی تھی، اس علمی رہنمائی کی بدولت استاد کا درجہ دیتا ہوں۔ خدائے بزرگ برتر آپ کو تادیر بصحت و عافیت رکھے۔

امید ہے آں محترم بخیر ہوں گے۔

فقط والادب

(ڈاکٹر) شعائراللہ خاں وجیہی

(۲۲)

بھوپال۔ ۱۲ر جولائی ۲۰۰۶ء

محترم المقام سلام و نیاز!

''میں اردو ہوں'' کتاب اپریل میں موصول ہوگئی تھی اور اس وقت میں نے مبارکباد کا خط بھی تحریر کرلیا تھا مگر افسوس ہے کہ ارسال کرنے میں تاخیر ہوئی، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس خاص عنایت و نوازش کے لیے میں ممنون ہوں۔ یہ کتاب یقیناً اردو سے آپ کے لگاؤ اور آپ کی محبت کی مظہر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ کتاب یہ ثابت کرتی ہے کہ اردو صرف زبان ہی نہیں بلکہ باہمی روابط کا ذریعہ بھی ہے۔ اس کتاب کے ۳۳ عنوانات جو اردو کی ہر جہت اور اس کے ہر پہلو کو اجاگر کرتے ہیں، اپنے آپ میں ایک

تاریخ ہیں اور یقین ہے کہ پرانی اور درمیانی نسل اس کی خوبیوں کو سمجھے گی اور سراہے گی۔

آپ نے اس کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور اسے واضح کیا ہے۔ جس میں اردو کے فوائد اور اس کے نقصانات مضمر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں اگر لوگ مشعلِ راہ بنائیں تو شاید آگے کی منزل نظر آنے لگے۔ میری جانب سے۔ بہت بہت مبارک باد قبول کیجیے اور اسی طرح اپنے افکار و خیالات سے روشنی بکھیرتے رہیے۔

میں نے کتاب کا بغور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اس کتاب میں کہیں کہیں مجھے کچھ غلطیاں بھی نظر آئیں جس سے لگا کہ پروف ریڈنگ پر شاید زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی۔ مثال کے طور پر ٹائٹل پر تحریر ہے ''اے میرے بھائیو اور بہنوں'' چوں کہ اے سے جملہ تخاطب کا اظہار ہوتا ہے اس لیے ''بہنوں'' میں بھی ''بھائیو'' کی طرح نون غنہ کا استعمال نہیں ہونا چاہیے تھا اور صرف ''بہنو'' ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہی غلطی صفحہ ۲۹ پر سردار جعفری کی نظم ''پیغامِ بیداری'' کے مطلع میں ہوئی ہے۔ ''باغبانوں اٹھو نوجوانوں اٹھو'' یہاں بھی دونوں مصرعوں میں نون غنہ کا استعمال غلط ہوگیا ہے صرف 'باغبانو' اور ''نوجوانو'' ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۳۴ پر عقیل نعمانی کے شعر کا دوسرا مصرع خارج از بحر ہوگیا ہے۔ صفحہ ۹۸ پر بھی اشک امرتسری کا دوسرا مصرعہ بحر سے خارج ہوگیا ہے۔ اسی جگہ ''تصویریں'' کی جگہ ''تصویر'' سے مصرع بحر سے خارج ہوگیا۔ اگر کتاب میں اس قسم کی غلطیاں نہ ہوتیں تو بہت بہتر تھا۔

چوں کہ آپ ماہر لسانیات ہیں اس لیے اس طرف آپ کی توجہ مرکوز کرانا میں نے ضروری سمجھا۔ امید ہے کوئی خیال نہیں فرمائیں گے اور اگلے ایڈیشن میں ان غلطیوں کو درست کرلیں گے۔ حالاں کہ اگر کمپوزنگ توجہ کے ساتھ کی جاتی تو اس قسم کی غلطیاں نہیں ہونے پاتیں۔ تاہم جہاں تک آپ کا جذبہ اور اردو سے آپ کی محبت ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ یقیناً آپ نے اردو سے متعلق بے حد مفید معلومات فراہم کی ہیں جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ شکریہ

خیر اندیش

رہبر جونپوری

(۲۳)

گوالیر

۱۵؍جولائی ۲۰۰۶ء

محترم عبدالقوی دسنوی صاحب   آداب وسلام

اردو زبان کے لیے آپ کے دلی جذبات کا بہترین مجموعہ ''میں اردو ہوں'' موصول ہوا۔ آج کے دور میں ایک اہم اور ضروری کتاب کا منظرِ عام پر لانے کے لیے آپ کو دلی مبارکباد۔

آپ کے دل سے نکلی اردو کی درد بھری آواز کاش اردو والوں کے دل و دماغ کو بیدار کر سکے۔

قمر برتر

آپ کی گراں مایہ تصنیف پر تبصرہ اگلے شمارے میں شاملِ اشاعت ہے۔

(۲۴)

حاجی پور (بہار)

۲۷؍جولائی ۲۰۰۶ء

محترم المقام قابلِ احترام جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب!

سلام وعقیدت

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

گزشتہ ۲۵؍جولائی ۲۰۰۶ء کو آپ کی تصنیف ''میں اردو ہوں'' بذریعہ رجسٹری ڈاک موصول ہوئی جسے برادرم ڈاکٹر شاہد اقبال (گیا) نے میرے پتہ پر ارسال کیا ہے۔ (کتاب پر آپ کے دستخط کے ساتھ ۱۸؍مئی ۲۰۰۶ء کی تاریخ درج ہے) یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ نے مجھ ناچیز کو اس لائق سمجھا اور اپنی تصنیف مجھے عنایت فرمائی۔ کتاب میں شامل وہ سارے مضامین جو ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں شائع ہوئے ہیں انھیں میں نے نہ صرف پڑھا ہی ہے بلکہ اس سے متاثر بھی ہوا ہوں اور آپ کی ان تحریروں سے مجھے تحریک بھی ملتی رہی ہے۔ اب یہ ساری تحریریں جو یکجا صورت میں مجھے مل گئی ہیں اسے

میں اپنے مشن کے لیے ایک اثاثہ سمجھ رہا ہوں۔ ان تحریروں کی افادیت کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اردو کی نئی نسل کے لیے یہ کتاب ایک بیش بہا نعمت سے کم نہیں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور آپ صحت مند رہیں۔ آمین!

محتاجِ دعا
انوارالحسن وسطوی

(۲۵)

بھوپال
۷ راگست ۲۰۰۶ء

قبلہ محترم عالیجناب عبدالقوی دسنوی صاحب دامت برکاتہم سلام و نیاز!

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کی نگارشات کے بارے میں اظہار خیال کروں ''یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے'' پھر بھی جو بیش قیمت خیالات آپ نے رقم کیے ہیں بقدر استطاعت ان کی تائید کر کے حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو حاضر ہوں۔

فقط والسلام

نیازمند
ظفر (نسیمی)

''میں اردو ہوں''

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تازہ تصنیف ''میں اردو ہوں'' اردو کی حمایت میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تاثرات کے ساتھ مشاہیر ادب کے خیالات بھی شامل کرلیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

دسنوی صاحب کے مضامین میں ایک ایک لفظ سے اردو کی محبت چھلکتی ہوئی محسوس

ہوتی ہے۔ مادرِ وطن کے لیے محبت کا جذبہ چھوٹا پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک ایک سانس ادب اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے لیے وقف ہے۔ کتاب کا سرِ ورق اتنا دل آویز ہے کہ دیکھتے ہی بنتا ہے، اس پر لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے فقرے ان کے دل کی آواز ہیں جن کا مفہوم ہے:

"اردو محبت کی، مساوات کی، احترام آدمیت کی اور وطن پرستی کی زبان ہے۔

اردو جنگ آزادی کی للکار ہے۔ اردو کا نعرہ ہے:

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پربت میں ہے"

بعض ادیب حضرات جب اردو کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اکثر ان کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے، کبھی وہ حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، کبھی اردو کے اساتذہ کی مذمت کرتے ہیں اور کبھی بچوں کے سرپرستوں کو لعن طعن کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات راشٹر بھاشا کی توسیع کو بھی اردو دشمنی پر محمول کرتے ہیں۔

دسنوی صاحب کی شائستگی اور نرم مزاجی اس لیے قابلِ تعریف ہے کہ ان کا دل لسانی تعصب سے پاک ہے۔ ان کے قلم سے اردو زبان یہ پیغام دیتی ہے کہ:

"میں نفرت کی نہیں بلکہ محبت، اتحاد و اتفاق اور وطن دوستی کی زبان ہوں"۔

ان کے دل میں محبت کا ایسا اٹوٹ جذبہ موجود ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ:

"اردو ہندوستان کے ہر حصے میں مسکراتی، کھلکھلاتی، چہکتی، مچلتی محبت کے نغمے الاپتی اتحاد کے گیت گاتی اور ہر قسم کے تعصب اور نفرت کے خلاف آواز اٹھاتی رہے"۔

موصوف نے اپنے مضامین میں اردو کے لیے مصنوعی محبت رکھنے والوں کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھی ہے۔ اردو کے اساتذہ طلبا اور سرپرستوں کو مفید مشوروں سے نوازا ہے اور اردو کی بقا کے لیے اشارے بھی دیے ہیں۔ اردو رسم الخط کے بارے میں ان کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ:

"اردو رسم خط ہر اعتبار سے مناسب ہے۔ اردو اس کے بغیر اردو نہیں رہے گی اس لیے اگر تنگ دل رسم خط بدلنے کے سلسلہ میں کوئی بے معنی بات کہنے کی

جرأت کرتا ہے تو کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنی چاہیے''۔

دسنوی صاحب نے اپنے مضمون ''شمع بہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے'' میں کچھ نکات پیش کیے ہیں اور کچھ ٹھوس تجاویز رکھی ہیں جن پر عمل کر کے اردو کو بچایا جاسکتا ہے۔ جو مشورے آپ نے دیے ہیں وہ اجتماعی عمل کے بجائے انفرادی عمل کے دعوت دیتے ہیں اور کسی بھی اردو دوست کے لیے ان پر عمل کرنا مشکل نہیں ہے۔

لائبریریاں، علمی ادارے اور محبانِ اردو اس کتاب سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اس خوبصورت اور کارآمد کتاب کو مصنف سے مفت حاصل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جو قیمت ناشر نے مقرر کی ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے تاہم اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا:

''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز''

ظفر (نسیمی)

(۲۶)

پٹنہ۔۸ر ستمبر ۲۰۰۶ء

محترمی سلام علیک

ایک اجنبی کی آمد پر آپ حیرت زدہ ہوں گے۔ ویسے آپ میرے لیے اجنبی نہیں۔ غائبانہ تعارف آپ کی تحریروں کے ذریعہ ہوتا رہا۔ چند دن قبل آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' کی ایک جلد ہمارے ہم زلف برادرم وسیم حیدر کاغذی محلہ بہار شریف کے توسط سے ملی اور پڑھنے کا موقع ملا۔ تمام مضامین کو ایک جا کر کے آپ نے اچھا کیا یہ احسن قدم ہے اردو کے حوالے سے اتنے موضوع پر قلم اٹھانا آپ ہی کا کام ہے۔ تمام مضامین خوب ہیں۔ دل کو چھو جانے والے ہیں۔ آپ نے اپنا خونِ دل تحریر میں گھول دیا ہے۔ ایک ایک لفظ کرب میں ڈوبا ہوا ہے۔ کاش اردو داں طبقہ وقت کی نزاکت کو سمجھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اردو کے دشمن ہم خود ہیں۔ حکومت کو بدنام کرنا غلط ہے۔ کچھ کوتاہیاں حکومت کی ضرور ہیں۔ اس کا سبب بھی ایک خاص خیال کے لوگوں کی کرم فرمائی ہے جو حکومت میں در آئے ہیں۔ بہرکیف ہم ادیبوں کا کام مسائل کی طرف نشاندہی کرنا ہے وہ کرتے جاتے ہیں۔

میں آپ کو آپ کی کاوش پر مبارکباد دیتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں۔ "لوگوں کے دلوں میں بھی اتر جائے تری بات" اور لوگ اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر اردو کی بقا کے لیے کام کریں۔ اردو جن کی روٹی روزی کا ذریعہ ہے وہی اردو کو اپنے گھر سے نکال رہے ہیں، اسے زندہ دفن کر دینا چاہتے ہیں۔ اردو کا جادو سبھوں کے سر چڑھ کر بولتا رہتا ہے۔ سبھی اس کے جادو بیانی کے قائل ہیں مگر اس کو اس کا حق دینے سے کتراتے ہیں۔ اردو اپنے گھروں میں نظر انداز کی جارہی ہے۔ اردو اخبار کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا ہم کسرِ شان سمجھتے ہیں یا پھر احساسِ کمتری کے شکار ہیں۔ اردو داں طبقہ اردو اخبار و رسائل خرید کر پڑھنے کو روادار نہیں ہے نتیجہ سامنے ہے کتنے ہی ادبی پرچے مالی بدحالی کے شکار ہو کر بند ہو گئے، کچھ زندہ ہیں وہ بھی نوحہ کناں ہیں۔ شاید آخری سانس لے رہے ہیں۔ رسالے اور اخبارات کی تعداد کم ہے قاری کی تعداد گھٹ رہی ہے۔

آج بھی ہم صرف ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ جائیں اور اردو کی بقا کے لیے خلوص دل سے کام کریں تو انشاء اللہ اردو اپنا مقام حاصل کر لے گی۔ لوگ اسے مارنے کی لاکھ کوشش کریں یہ مر نہیں سکتی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ہاں میرا تعارف تو رہا جاتا ہے۔ میرا نام سید مظفر عالم، والد کا نام ڈاکٹر سید ظفر عالم مرحوم، ساکن پٹنہ۔ ویسے دادیہال سید آباد ضلع جہاناباد۔ ہمارے نانا جان سید اقبال حسین صاحب مرحوم شمس الہدیٰ مدرسہ میں معلم تھے۔ میں ۱۹۴۶ء کے بعد سے پٹنہ میں مقیم ہوں اور یہاں والد نے مکان خرید لیا اسی نسبت سے میں اپنے کو ضیا عظیم آبادی بھی لکھنے لگا ہوں۔ شاید میری کسی تخلیق پر آپ کی نظر پڑی ہو۔ زبان و ادب پٹنہ سے چھپنے کا آغاز ہوا۔ سہیل گیا، مورچہ اور ہماری زبان ہفتہ وار میں بھی ایک نظم اردو زبان ۱۹۸۳ء میں چھپی تھی۔ الحسنات رامپور میں بھی چیزیں چھپتی رہتی ہیں۔ گلبن لکھنؤ میں بھی تخلیق چھپتی ہے۔ بہر کیف یہ مختصر تعارف میں نے اپنا کرادیا۔ خدا کرے یہ تعارف آگے روابط کا ذریعہ بنے۔

طالب خیر

مظفر

(۲۷)

مالیگاؤں

۹/اکتوبر ۲۰۰۶ء

محترم جناب عبدالقوی دسنوی صاحب

السلام علیکم!

کل ہی میں نے محترم جناب کوثر صدیقی صاحب ''مدیر کاروانِ ادب'' سے درخواست کی تھی کہ مجھے اب تک جناب عبدالقوی دسنوی کی کتاب ''میں اردو ہوں'' ملی نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان تک میرا خط پہنچا ہے یا نہیں بہرحال!

آج ۹/اکتوبر کو دوپہر کی ڈاک سے ''میں اردو ہوں'' دستیاب ہوئی۔ کتاب بہت ہی خوبصورت ہے۔ ٹائٹل کور بھی خوب دلکش ہے آرٹسٹ نے گیسوئے اردو کو کچھ اس طرح اسٹروک دیا ہے کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ شاید ایک آدھ بال اصل بھی ہوں۔ کتاب کے مشمولات کو سرسری طور پر، ابھی دیکھا ہے جس سے آپ کی محنت اور تڑپ اور اردو سے بے پناہ لگاؤ کا احساس ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ ان سطروں میں بھی اپنا کلیجہ نکال دیا ہے اور لفظ لفظ کو اپنے خونِ دل سے قرطاس پر اتارا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے ضرور دوں گا۔

(ڈاکٹر) نخشب مسعود

(۲۸)

حاجی پور، ضلع ویشالی

۱۴/نومبر ۲۰۰۶ء

گرامی قدر، محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب!

سلام وعقیدت

آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' گزشتہ جولائی ۲۰۰۶ء میں بتوسط ڈاکٹر شاہد اقبال (گیا) موصول ہوئی تھی جس کی رسید میں نے آپ کی خدمت میں بھی ارسال کی تھی۔ کتاب پر اپنے تاثرات رقم کر کے پٹنہ کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''قومی تنظیم'' کو

ارسال کیا تھا، لیکن بوجوہ وہ شائع نہیں ہو سکا۔ انتظارِ بسیار کے بعد گزشتہ ماہ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں دوبارہ اپنی تحریر اخبار کو بھیجی، بحمد اللہ اس بار کامیابی ملی اور اخبار کے ۱۱ر نومبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں وہ پوری طرح موجود ہے۔

محترم! آپ کی اس گراں قدر تصنیف پر کوئی بڑا اہل قلم اگر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا تو واقعی ایک قیمتی تحریر سامنے آتی لیکن مجھ جیسے کم علم اور اردو کے ادنیٰ طالب علم سے جو بن پڑا وہی کر سکا ہوں۔ میں خود اعتراف کرتا ہوں کہ کتاب جس تبصرہ اور تاثرات کی حامل ہے راقم السطور اس کا حق ادا نہیں کر سکا ہے۔ میری حیثیت تو اس ضعیفہ کی طرح ہے جو سوت کی ایک پوٹلی لے کر بازارِ مصر میں حضرت یوسفؑ کو خریدنے صرف یہ سوچ کر گئی تھی تاکہ اس کا نام بھی حضرت یوسفؑ کے خریداروں میں شامل ہو جائے۔ بس میں نے بھی آپ کی کتاب پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس لیے اظہارِ خیال ضروری سمجھا کہ شاید میرا نام بھی آپ کے عاشقوں کی فہرست میں اخیر میں سہی درج ہو جائے۔

دعاؤں سے نوازتے رہیں گے، ممنون ہوں گا۔

طالب دعا
انوار الحسن وسطوی

(۲۹)

آسنسول
۲۰ر نومبر ۲۰۰۶ء

محترم المقام　　　　السلام علیکم

''میں اردو ہوں'' پر تجزیہ و تبصرہ ملک کے کئی بڑے رسائل و جرائد میں پڑھتا رہا ہوں، تمام ہی لوگوں نے آپ کی محنت کی داد دی ہے۔

اس مہنگائی کے دور میں جب کہ لوگ شعری مجموعوں اور افسانوی مجموعوں کے دام دوسو، تین سو روپے رکھ کر اپنی اور کتاب کی اہمیت واضح کر رہے ہیں۔

آپ کا نعرہ
''مادری زبان اردو سے محبت، وطن ہندوستان کی خدمت اور احترام آدمیت'' کچھ

عجیب سا لگ رہا ہے۔ کیا یہ قربانی کسی کام آئے گی؟

چوں کہ کتاب مطالعہ میں نہیں ہے اس لیے اس سلسلے میں مزید خامہ فرسائی بیکار۔

اللہ آپ کو صحت مند رکھے تا کہ پورے خلوص سے آپ اردو ادب کی خدمت کر سکیں۔

خیر اندیش
نذیر احمد یوسفی

(۳۰)

بیتول
۳۰ر دسمبر ۲۰۰۶ء

احترام المقام عبدالقوی دسنوی صاحب السلام علیکم!

آپ کی کتاب ''میں اردو ہوں'' حیدر بیابانی کی معرفت پڑھنے کو ملی۔ آپ کو اردو کے ایک بے لوث رضا کار کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ اردو سے متعلق آپ کی محبت جگ ظاہر ہے۔ آپ کا کام فردِ واحد کا نہیں لگتا بلکہ آپ کی ذات میں اردو کے کچھ اور بھی بہی خواہ بیک وقت موجود ہیں۔ کتاب پا کر اور پڑھ کر مسرت ہوئی، دل سے دعا نکلی کہ خدا آپ جیسے لوگوں کو عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین

آپ کا ایک پرستار
حمید اللہ خلیل برہانپوری

(۳۱)

بھوپال
۲ر فروری ۲۰۰۷ء

محترم سلام مسنون!

امید کہ صحت و سلامتی کے ساتھ بخیر و عافیت ہوں گے۔ عزیزہ پروین کیف سے ''میں اردو ہوں'' برائے مطالعہ ملی۔ حالاں کہ ہمیشہ سے ہی آپ کا مداح رہا ہوں اور مختلف رسائل میں آپ کے مضامین پڑھتا رہا ہوں لیکن بیشتر مضامین کتابی شکل میں پڑھ کر آپ

کی اردو دوستی اور والہانہ محبت کا مزید اندازہ ہوا اور بے ساختہ یہ شعر ذہن میں کوندنے لگا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۵۰ء سے جوش، فراق، جگر، فیض صاحبان سے بارہا ملاقاتیں رہیں، عظیم المرتبت علما، ادبا، دانشوروں سے بھی فیض صحبت حاصل رہا لیکن بخدا آپ جیسا اردو سے بے لوث محبت کرنے والا اردو کا پرستار کوئی نہ پایا۔ "میں اردو ہوں" کے مطالعے سے اس قدر متاثر ہوا کہ چند شعر ہو گئے نیز ایک تاثراتی مضمون بھی لکھ ڈالا جو بذریعہ ڈاک ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔

پروین کیف سے فون پر اجازت لے کر ڈاک سے بھیج رہا ہوں ورنہ کتاب کی واپسی پر انھیں کے سپرد کرتا۔ چوں کہ عرصے سے بیمار ہوں اب کم ہی نکلنا ہوتا ہے ورنہ اس بیش بہا اشاعت کی مبارکباد دینے خود حاضر ہوتا اور شرفِ ملاقات حاصل کرتا۔

خدا تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ سالہا سال تک اردو کی خدمت کا جذبہ بے پایاں عطا فرمائے۔

خلوص کار

رضا رامپوری

"میں اردو ہوں"

نہیں میں ترش رو، مجھ سے نہ گھبراؤ "میں اردو ہوں"
کشادہ دل سے تم میرے قریب آؤ "میں اردو ہوں"
کہا شیریں، لگایا جس نے ہونٹوں سے مجھے اپنے
بنو شیریں سخن تم مجھ کو اپناؤ "میں اردو ہوں"
غبارِ وقت سے آلودہ میرا سر ہوا لوگو!
کرو شانہ، میری زلفوں کو سلجھاؤ "میں اردو ہوں"
سنوارا مجھ کو حالی اور سرسید نے الفت سے
میری گم گشتہ لذت پھر سے تم پاؤ "میں اردو ہوں"

تھی میری سلطنت تا مشرق و مغرب پہ مت بھولو
حکومت تھی دلوں پر اب وہ لوٹاؤ ''میں اردو ہوں''

میرے بارے میں اقبال و ملاّ نے کہا دیکھا
سنہرے ان کے وہ اقوال دہراؤ ''میں اردو ہوں''

رضا وابستہ اردو رہا ہے اک زمانے سے
میرے پیارو زباں اس کی نہ کھلواؤ ''میں اردو ہوں''

(محترم عبدالقوی دسنوی صاحب کی کتاب ''میں اردو ہوں'' کے مطالعہ سے متاثر ہوکر چند اشعار—رضا)

قوی دسنوی پیمبرِ اردو

پیغمبر کے لغوی معنی پیغام دینے والا ہے اسی لیے خدا کی طرف سے الہامی پیغامات قوم کو پہنچانے والا بھی پیغمبر کہا جاتا ہے۔ اگر جناب قوی دسنوی صاحب کو اردو کا پیغام پہنچانے والا ''پیمبرِ اردو'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کی تازہ تخلیق ''میں اردو ہوں'' کتابی شکل میں ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ادبا، شعراء، دانشوروں اور علماء نیز چند سیاسی سماجی رہنماؤں کے اردو کے بارے میں ان کے خیالات و افکار کو قوی صاحب نے اپنے مضامین میں پروکر اہلِ ملک کو اردو سے محبت اور رغبت کے پیغام دیے ہیں۔

''میں اردو ہوں'' کے جملہ مضامین قوی دسنوی صاحب کی اردو سے محبت اور بے لوث خدمت کا بین ثبوت ہیں۔ اردو کی تاریخ مرتب کی جائے تو یہ دستاویزی تخلیق بذات خود تاریخی حیثیت کی حامل نظر آئے گی، ہندوستان کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے رسائل اور منعقد ہونے والے سمیناروں میں قوی دسنوی صاحب نے جو لکھا اور پیش کیا وہ تمام یکجا کتابی شکل میں، علماء، ادبا، شعرا کے افکار، اشعار اور آرا کے ساتھ شائع کرکے اردو دوستوں کو اردو سے محبت کرنے، اردو لکھنے، اردو پڑھنے اور پڑھانے کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ ایک ایسا درد دیا ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن اس درد کو محسوس کرنے والا خود تڑپ سکتا ہے تڑپا نہیں سکتا، اپنے اس درد کو بانٹنے کا کام قوی دسنوی صاحب ایک عرصہ سے کرنے میں مصروف ہیں، کاش یہ تڑپ ہر اردو دوست کے دل میں سما جائے

اور ہم اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔

میں ۴۶-۱۹۴۵ء میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو میرا کلاس فیلو ستیش نام کا ایک لڑکا تھا۔ چوں کہ اس وقت تمام نصابی کتابیں اردو میں تھیں، ستیش بھی اچھی اردو جانتا تھا لیکن جب ۱۹۵۰ء میں ہندی قومی زبان قرار دی گئی اور ہندی تعلیم لازمی کی گئی تو تمام طلبا کو ہندی کی ابتدا کرنی پڑی جب کہ ستیش ہندی پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھا، میں نے جب اس سے دریافت کیا کہ تم ہندی کہاں سیکھ رہے تھے تو اس نے بتایا کہ اسکول کے کام سے فراغت کے بعد میرے پتا اور دادا جی روز مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو ہندی پڑھایا کرتے تھے۔ اس واقعے کو یہاں بیان کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ قبل آزادی جب اردو فارسی کا بول بالا تھا، ہمارے ہندو بھائی اپنے بچوں کو گھروں میں ہندی تعلیم اس لیے دیتے تھے کہ گیتا، رامائن اور چاروں ویدوں کے سنسکرت سے ہندی ترجمے پڑھ کر بچے اپنی مذہبی معلومات سے باخبر ہو سکیں۔ جب کہ ہماری مذہبی کتب احادیث اور کلامِ الٰہی کے تراجم بھی عربی فارسی سے اردو میں موجود ہیں لیکن ہم نے اپنے بچوں کو اردو سے ناواقف رکھ کر مذہب سے، تاریخ سے اور اپنی تہذیب سے بھی دور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ اردو کو سرکاری طور پر اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا لیکن کیا یہ ہماری ذمہ داری نہیں کہ ہم اپنی تاریخ سے، احادیث سے اور مذہبی معلومات سے اپنے بچوں کو اور آنے والی نسلوں کو واقف رکھیں اور انھیں اردو کی تعلیم دیں تاکہ وہ اردو سے محبت کریں اور اس مساوات کی زبان، وطن دوستی کی زبان، محبت اور احترام آدمیت کی زبان اور جنگ آزادی میں اہم حصہ لینے والی زبان کو پڑھ کر بہتر زندگی گزار سکیں۔

مانا کہ اردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں لیکن کچھ کٹر، تنگ ذہن اور سیاسی افراد نے اسے اپنے مفاد کے لیے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر صدیوں کے بھائی چارے کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کی لیکن ان کوششوں کو ناکام کرنا بھی ہمارا ہی فرض تھا، لیکن ہم بے حسی کا شکار بن کر خود اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچا بیٹھے اور پہنچا رہے ہیں۔

قوی دسنوی صاحب نے اسی بے حسی کو دور کرنے کی ترغیب اپنے مضامین سے دلانے کی کوششیں کی ہیں۔ ہندی اخبارات میں ساٹھ فیصد اردو الفاظ استعمال ہو رہے

ہیں، بلکہ فارسی الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں وہ بھی اردو کی مقبولیت کی دلیل ہیں اس لیے ہم اہلِ اردو کو اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا ہے مگر اب ضرورت ہے بیداری کی۔ اگر ہم اپنے گھروں میں اردو تعلیم کو فروغ نہیں دیں گے تو ہمارا اپنا ہی، قومی ملی اور تہذیبی نقصان ہوگا۔

رضارامپوری
۱۵۷۴۔ سندر نگر، اشوکا گارڈن، بھوپال۔ ۲۳

پروفیسر عبدالقوی دسنوی